دار المصنّفین کی تاریخی کتابیں

تاریخ صقلیہ جلد اول، مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی اور اسپین کی طرح اسکو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا، اور تقریباً پانسو برس تک اس سے وابستہ رہے، مگر افسوس ہے کہ اس کی کوئی تاریخ اردو انگریزی میں کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی، چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اسکی تاریخ مرتب کی گئی ہے، جن میں سے پہلی جلد اب شائع ہو گئی ہے، جو سیاسی سرگذشت پر مشتمل ہے، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج، اسلامی حکومت کے خاتمہ اور صقلیہ و جزائر صقلیہ میں مسلمانوں کے مصائب جلاوطنی کا تفصیلی مرقع دکھایا گیا ہے، ضخامت مجموعی ۴۳۰ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ، قیمت: للعہ، جلد دوم زیر طبع ہے، مرتبہ سید ریاست علی ندوی،

تاریخ فقہ اسلامی، مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہا پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہے جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے، حجم ۴۰۰ صفحے، قیمت: للعہ، مترجمہ مولانا عبد السلام ندوی،

رقعات عالمگیر، اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط اور رقعات جو شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں اور ان سے علم و ادب، سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ضخامت ۴۰۴ صفحات، چھپائی لکھائی کاغذ بالخصوص ٹائیٹل نہایت دلفریب، قیمت: للعہ، مرتبہ سید نجیب اشرف ایم اے ندوی

مقدمہ رقعات عالمگیر، اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اسلامی فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشا کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشا، اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی ہے، لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ، ضخامت ۴۰۰ صفحے، قیمت: عہ، مصنفہ سید نجیب اشرف ایم اے، ندوی،

الفاروق یعنی حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت، صحابہ کے فتوحات، طریقۂ حکومت، عراق و شام، مصر و ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر،

مولانا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گراں پایہ کتاب کے بیسیوں اڈیشن فروخت ہو رہے ہیں مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جو حرف بحرف نامی پریس کانپور کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائیٹل، ضخامت ۳۱۲ صفحے، قیمت: للعہ

خلفائے راشدین، سیر المہاجرین کا حصہ اول، یہ چاروں خلفا کے ذاتی فضائل اور مذہبی و سیاسی کارناموں اور فتوحات کا تذکرہ، حجم ۴۰۰ صفحے، قیمت: ہے، از مولانا حاجی معین الدین ندوی

(دار المصنفین کی کتابوں کی مفصل فہرست دفتر دار المصنفین اعظم گڈہ سے طلب کیجئے)

مسعود علی ندوی، منیجر دار المصنفین اعظم گڈہ

جلد ۳۸ | ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۶ء | عدد ۲

مضامین

شذرات

سر فضل حسین کا ماتم ملک کے گوشہ گوشہ میں برپا ہے، مرحوم کے سیاسی مسلک سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو مگر ان کی قابلیت، تدبیر، بیخوفی، دلیری، ہر دلعزیزی اور قومی بہی خواہی سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، وہ ان حکومت پسندوں میں نہ تھے جو اپنی شخصی ترقی کو صرف اپنی خاندانی ترقی کا زینہ بناتے ہیں، بلکہ ان میں تھے جو حکومت کا ساتھ دیکر اپنی سمجھ کے مطابق قوم اور ملک کی بھلائی کرتے ہیں، مرحوم کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ جس محفل میں ہوتے تھے اس پر چھا جاتے تھے، وہ فطری لیڈر تھے اور دوسرے ان کے ساتھ چلنے پر مجبور تھے، وہ سرا ئے کی کونسل کے ممبر ہو کر گویا یہ کہنا چاہئے وہ صرف ممبر نہیں رہے تھے، بلکہ اپنی دانائی، عزم، حسن تدبیر اور دلائل کی قوت کی بنا پر پوری کونسل کی عنانِ سیاست کے تنہا مالک تھے،

مرحوم مرض دق کے بیمار تھے، پھر بھی مجلسِ حکومت کی رکنیت سے علٰحدہ ہو کر انھوں نے آرام نہیں کیا، بلکہ سیاسیاتِ پنجاب کی الجھی ہوئی گتھی کو اپنی شبانہ روز کی محنت سے سلجھانے میں مصروف ہو گئے، اور یہ ان کا کمال سمجھنا چاہئے کہ وہ ہندؤوں اور مسلمانوں کی ایک متحدہ سیاسی پارٹی بنانے میں کامیاب ہو گئے اور خود اعتمادی یہ تھی کہ ہر مخالف کوشش کو بے حقیقت سمجھ کر اپنے کام میں بے خوف لگے رہے، گو ہم کو یہ معلوم ہے کہ اس متحدہ پارٹی کی پراگندہ اوراق کتاب کا شیرازہ کس نے باندھا، تاہم مرحوم کی مہارتِ فن کی داد دینی پڑتی ہے کہ خود شیرازہ بند کو بھی یہی محسوس ہوتا تھا کہ ان منتشر اوراق کا شیرازہ خود ان کی ذات ہے، پروردگارِ عالم ان پر رحمت فرمائے، اور اپنے فضل و کرم سے آخرت کی عزت سے بھی ان کو سرفراز کرے،

سید رشید رضا اڈیٹر المنار مصر کی وفات سے یہ ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کا بین الاقوامی اسلامی رسالہ المنار بند ہو جائے، مگر ان کے عزیزوں اور دوستوں کی کوشش سے یہ خطرہ دور ہو گیا، المنار اب پھر نکلنا شروع ہو گیا ہے، انکی تفسیر کے سلسلہ کو شام کے مشہور سلفی عالم شیخ بہجت عطار نے اور رسالہ کی اڈیٹری کے فرض کو سید مرحوم کے بھتیجے سید محی الدین رضا نے اپنے ذمہ لیا ہے، اور محرم ۱۳۵۵ھ کے حساب سے اس کی اشاعت شروع کر دی ہے، امید ہے کہ رسالہ اپنی عالمگیر اسلامی حیثیت کو قائم، اور مرحوم کے روحانی فیض کو جاری رکھے گا،

اعظم گڈھ میں بمقام سرائے میر عربی کا ایک جدید طرز کا مدرسہ مولانا شبلی مرحوم کے بنائے ہوئے خاکہ کے مطابق مدرسۃ الاصلاح کے نام سے پچیس چھبیس برس سے قائم ہے، اس کے ناظم مولٰنا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، مولٰنا حمید الدین صاحب نے مراجعتِ وطن کے بعد اپنی بقیہ زندگی اسی مدرسہ کی علمی و تعلیمی رہبری میں صرف فرمائی، اسی کی خاطر انھوں نے ہزار روپیے ماہوار کی نوکری چھوڑی، گھر بار چھوڑا، مدرسہ ہی میں بود و باش اختیار کی، اور وہاں کے طلبہ و مدرسین کو قرآنِ پاک کا درس دینا شروع کیا، اور اپنی ساری متاعِ علمی مدرسہ کے چند ہونہار طلبہ کے سپرد کر دی،

اس مدرسہ کا مقصد یہ ہے کہ عربی صرف و نحو کی دقتوں کو کم کر کے عربی علوم کی تعلیم دیجائے، قرآنِ پاک کو اس تعلیم کا محور بنایا جائے، دوسرے علوم کو قرآنِ پاک کا خادم سمجھ کر سکھایا جائے، اور فلسفہ و منطق کی دوراز کار کتابوں کو بہت کم کر دیا جائے، مدرسہ کا کاروانِ عمل شروع سے آج تک اسی راہ پر چل رہا ہے، اور اچھے نتیجے پیدا کر رہا ہے، اس میں کام کرنے والے چند مدرس نہایت ایثار پیشہ، بے غرض اور مخلص علما رہیں، جن میں کچھ ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ، اور کچھ خود اسی مدرسہ سے نکلے ہوئے ہیں، مدح و ستایش نہیں واقعہ ہے کہ ان مدرسین نے مہینوں قوت لایموت پر گذر کر کے اور سالہا سال تنخواہ نہ پا کر اس اخلاص اور ایثار کے ساتھ

کام کیا ہے، اور اب تک کر رہے ہیں کہ ہمارے موجودہ قومیات میں اس کی مثال مشکل سے ملیگی،

اس پاس میں "علمائے زمانہ" کی کمی نہیں، انھوں نے اس کے مقابل دوسرا مدرسہ قائم کیا، اور اپنے مدرسہ کے چلانے کے لئے یا اپنے زعم میں نیک نیتی سے وقتاً فوقتاً مدرستہ الاصلاح کے خلاف غلط افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کو اس کی امداد سے روکنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن ع دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تر ست ان کی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی، اور مدرستہ الاصلاح کا کام بڑھتا ہی رہا، چنانچہ کئی ماہ سے مدرستہ الاصلاح کے چند علماء نے مل کر مولٰنا حمید الدین مرحوم کی یادگار اور ان کی تصنیفات قرآنی کی اشاعت کے لئے دائرہ حمیدیہ قائم کیا ہے، اور اس کی طرف سے الاصلاح نام ایک رسالہ جاری ہوا ہے، جو ماہ بماہ کامیابی کیساتھ نکل رہا ہے،

یہ جدید ترقی مخالفوں کے سامان "ہیزم کشی" کے لئے آگ ثابت ہوئی، انھوں نے اسکی تباہی کے لئے اپنے آخری بے پناہ حربہ (کافرگری) کو استعمال کیا، اور تھانہ بھون، سہارنپور، دہلی، بمبئی اور دیوبند وغیرہ کے چند علماء کو مولٰنا شبلیؒ اور مولٰنا حمید الدینؒ کی چند بے محل عبارتیں دکھلا کر دونوں کی تکفیر کا فتویٰ لے آئے، جس پر اہم علمائے کرام کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں، پھر دہلی و میرٹھ و بچھرایوں وغیرہ سے ایک درجن ایسے علماء بلا کر لے آئے جو اپنے مخالفوں کو بہتر سے بہتر مذہبی اور اخلاقی گالیاں دے سکیں، چنانچہ مدرسہ کے قریب کی ایک زمین میں جلسہ جما کر تین روز تک پیہم ان دو مرحوموں کو اور ان کے تعلق سے مدرسہ کو بدتر سے بدتر کلمات ناشایستہ سے یاد فرماتے رہے،

یہ واقعہ اپنی نوع کا جیسا بھی ہو، تاہم ہم اپنے برادران و عزیزانِ مدرستہ الاصلاح کو مبارکباد دیتے ہیں کہ مخالفون کے اس کل مظاہرہ میں انھوں نے صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور ان کے پانوں تہذیب و متانت اور وقار و تمکنت کے جادہ سے الگ نہیں ہوئے، دوسری بشارت اس میں یہ ہو کہ دشمنوں نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چھوڑ دیا اور انھیں معلوم ہوگیا کہ ان کے بازؤں میں زور اور ہمارے سینوں میں مضبوطی کتنی ہو، اب وہ بھی آرام سے رہینگے اور ہم بھی آرام پائینگے،

مقالات

اسلام مین حیوانات کیساتھ سلوک

"اسلام میں جانور کو کھانے کے لئے ذبح کرنا جائز ہے، اور ساتھ ہی یہ کہ مسلمان کسی جانور کو مقدس سمجھ کر اسکی تعظیم و تکریم نہیں کرتے، نہ وہ کسی جانور کو اپنی ماتا کہتے ہین، اسلئے بعض فرقون کو یہ غلط فہمی ہو کہ اسلام میں کسی جانور کیساتھ نیک سلوک کرنا ثواب کا کام نہیں،

ذیل کا مضمون اسی غلط فہمی کے ازالہ کے لئے شائع کیا جاتا ہے، یہ درحقیقت سیرۃ نبویؐ کی چھٹی جلد کے چند صفحے ہین"

"س"

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لیکر آیا تھا، اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے، اس نے حیوانات کیساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی، اہلِ عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے مظالم کرتے تھے، وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے، اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم ان کو کھا جاؤ، اور اسکو فیاضی سمجھتے تھے، دو آدمی شرط باندھکر کھڑے ہو جاتے تھے، اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا، جو رک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوستو احباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے، یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی، ان واقعات کا ذکر اشعارِ عرب میں موجود ہے، ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا، تو اسکی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے

اور اسکو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے، اور وہ اسی حالت میں سوکھکر مرجاتا، ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے، اسلام آیا تو اوس نے اس سنگدلی کو مٹادیا،

عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے، آنحضرت صلعم نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا، اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے،[۱] ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنارہا تھا حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا، اور مرغی کیساتھ اس لڑکے کو لیکر اس کے خاندان میں آئے، اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو، کیونکہ رسول اللہ صلعم نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کے نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنارہے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گذر ہوا، تو وہ لوگ بھاگ گئے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے؟ جو لوگ ایسا کرتے ہیں، رسول اللہ صلعم نے ان کو ملعون قرار دیا ہے،[۲] اس سے بھی زیادہ بیرحمانہ طریقہ یہ تھا، کہ زندہ اونٹ کے کوہان، اور دنبہ کے دم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہ صلعم نے مدینہ میں آکر یہ حالت دیکھی، تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے، وہ مردار ہے،[۳] یہ ایک خاص صورت تھی، لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی ان کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی، اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی،[۴] بلاضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا،[۵] ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اگر کنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور

[۱] ترمذی ابواب الصید باب ماجاء فی کراہیۃ اکل المصبورہ ص ۲۵۵، [۲] بخاری کتاب الذبائح والصید، باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [۳] ترمذی ابواب الصید باب ماجاء ما قطع من الحی فہو میت، [۴] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [۵] مستدرک حاکم جلد ۲، ص ۱۰۲،

کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا، تو خدا اس کے متعلق اس سے بازپرس کریگا، صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اسکو ذبح کرے، اور کھائے یہ نہیں، کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے،[۱] اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا، اور وہ درندہ بھی نہیں اُن کا مارنا جائز نہیں، سنن نسائی میں ہے کہ جو شخص کنجشک کو بلاضرورت ماریگا، وہ قیامت کے دن خدا کے یہاں فریاد کریگی، کہ فلاں نے مجھ کو بلاضرورت مارا ہے، اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا،[۲] جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے، یا اون سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، ان کا مارنا بھی جائز نہیں، چنانچہ آپ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے،[۳]

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کئے جاتے ہیں، ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا، ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا، کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے اسلئے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو، تو اچھے طریقے سے مارو، اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو، تم میں ہر شخص چھری کو تیز کرلے، اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے،[۴]

ایک حدیث میں ہے، کہ ایک صحابی نے کہا کہ یارسول اللہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے، کہ بکری کو ذبح کروں، فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا تم پر رحم کرے گا،[۵]

یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی،[۶] کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے، کنکر پتھر، یا غلیل چلانے کی

[۱] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح ص ۳۵۸، [۲] نسائی کتاب الضحایا ص ۲۰۹، [۳] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۳۶۲، [۴] مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ [۵] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۴۳۶، [۶] نسائی صفحہ ۲۰۴

بھی ممانعت فرمائی، اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا، نہ دشمن شکست کھا سکتا، البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے، اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے[1] مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں،

جانوروں کے ساتھ جو بیرحمیاں کی جاتی تھیں، ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا، کہ جانوروں کو دُکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے، اس لئے رسول اللہ صلعم نے اہل عرب کو بتایا کہ جسطرح انسانوں کی ایذارسانی ایک شرعی جرم ہے، اسی طرح جانوروں کی ایذارسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے، چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپنے فرمایا کہ اُس پر صرف اسلئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا، اور اسکو کھانا پانی کچھ نہ دیا، اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مرگئی،[2] بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بنسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں اس لئے وہ اس معاملے میں بہت زیادہ گنہگار ہیں، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کیساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو، اگر خدا ان کو معاف کر دے تو سمجھو کہ اس نے تمھارے بکثرت گناہ معاف کر دیے[3]

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے، تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، اونھوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا، پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا، اس پر خدا نے ان کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا،[4] یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا، تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا، ایک حدیث میں ہے، کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے، چڑیا فرط محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی، رسول اللہ صلعم قضائے حاجت کے لئے گئے ہوئے تھے، واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اسکے بچوں کو پکڑ کر کس نے اسکو بیقرار کیا،

[1] بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقہ، [2] بخاری کتاب الانبیا صفحہ ۴۹۵، [3] مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۴۱۴، [4] بخاری جلد اول کتاب بدء الخلق ص ۴۶۷،

اسکے بچوں کو چھوڑ دو، صحابہ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا، دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا، کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا، تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کیلئے سزاوار ہے[1]،

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کیساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے، بعینہ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کیساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے، اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا، کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کیلئے پانی کے جو حوض بنائے ہیں، اُن پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہیں، اگر میں ان کو پانی پلادوں، تو کیا مجھکو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے[2]،

ایک حدیث میں ہے، کہ ایک شخص راستے میں جا رہا تھا، کہ اسکو سخت پیاس لگ گئی اتفاق سے اسکو ایک کنواں مل گیا، اور اُس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا، کنوئیں سے نکلا، تو دیکھا کہ کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے، اور کیچڑ چاٹ رہا ہے، اوس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اس پر ترس کھایا، اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا، اور اسکو پلایا، خدا کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا، اور خدا نے اسکو بخش دیا، صحابہ کرام نے اس واقعہ کو سُنا تو بولے کہ یا رسول اللہ کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے،؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کیساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے[3]،

اس اصول کی بنا پر رسول اللہ صلعم نے مسلمانوں کے تمام احسانات کو عام کر دیا، اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے، یا کھیتی باڑی کرتا ہے، اور اسکو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے، تو یہ ایک صدقہ[4] یعنی ثواب کا کام ہے،

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی کراہیۃ حرق العدو، [2] ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء، [3] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم، [4] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ،

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کیساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے

۱- جو جانور جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس سے وہی کام لینا چاہئے، چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا، بیل نے مڑکر کہا کہ میں اس کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہوں، صرف کھیتی باڑی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں[۱]، نیز فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، خدا نے ان کو تمھارا فرمانبردار صرف اسلئے بنایا ہے، کہ وہ تمکو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے، تمھارے لئے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتیں اسی پر پوری کرو[۲]، اگرچہ رسول اللہ صلعم نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پشت پر بے سبب بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے، صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہئے،

۲- جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہئے، چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو، تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ، اور جب قحط کے زمانے میں سفر کرو تو اسکو تیزی کیساتھ چلاؤ[۳]، تاکہ قحط کی وجہ سے اسکو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے، اس سے وہ جلد نجات پائے، ایک بار آپ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا، ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو، اور ان کو کھاؤ، تو ان کو اچھی حالت میں رکھکر کھاؤ،

۱ بخاری ابواب الحرث و المزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ، ۲ ابوداؤد کتاب الجہاد فی الوقوف علی الدابۃ، ۳ مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق،

ایک بار آپ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لئے گئے، اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ صلعم کو دیکھکر بلبلایا، اور آب دیدہ ہو گیا، آپ اس کے پاس گئے، اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا، اور فرمایا کہ یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آکر کہا کہ میرا، یا رسول اللہ فرمایا اس جانور کے بارے میں جس کا خدا نے تمکو مالک بنایا ہے، خدا سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اسکو بھوکا رکھتے ہو، اور اس پر جبر کرتے ہو[۱]،

۳- جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی، اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا[۲]،

۴- جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا[۳]، کہ اوس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں،

۱ ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم، ۲ ابوداؤد کتاب الجہاد باب وسم الدواب، ۳ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم،

وقت کی ایک اہم تالیف

"اورنگزیب اور اُس کا عہد"[ل]

مؤلفہ جناب ظہیر الدین صاحب فاروقی بی اے (علیگ) بیرسٹرایٹ لا بہرائچ،

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب رفیق دار المصنفین

"قرآن کے نظامِ سیاست نے ان ہندوؤں کی زندگی کو جو راسخ العقیدہ مسلمان حکمران کے زیرِحکومت تھے، ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا، اس نظامِ سیاست کا بہترین نمونہ اورنگزیب تھا جس نے اپنی عدیم المثال اخلاقی سیرت اور مذہبی سرگرمی سے اس سیاست کو منطقیانہ تتمہ پر پہنچانا فرض سمجھا، اس نے ہندوؤں کے علوم و فنون کو منتشر کر دیا، ہندوؤں کی عبادتگاہوں کو منہدم کر دیا، ہندوؤں کے میلوں اور تہواروں کو روک دیا، ہندوؤں پر مالی بار کا اضافہ کیا گیا، انھیں ہر لحاظ سے نیچا دکھایا گیا، ان کو حکومت کی ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا، پس اورنگزیب کے ماتحت جو ہندو تھے وہ اپنے علوم و فنون سے بے خبر ہو کر، مذہبی روایات سے بیگانہ ہو کر، معاشرتی ارتباط اور عام مسرتوں سے ناآشنا ہو کر زندگی بسر کر سکتے تھے، دولت اور خود اعتمادی سے بھی جو مواقع اور آزادی کے نتائج تھے وہ محروم تھے، غرضیکہ ان کی زندگی مستقل معاشرتی اور سیاسی ذلت ہو کر رہ گئی تھی"۔ (اورنگزیب از جادو ناتھ سرکار جلد ۵ ص ۴۹۵)

"اورنگزیب ایک کامیاب سپہ سالار، وزیر، مذہبی پیشوا، مکتب کا مدرس ہو سکتا تھا، لیکن قدرت کی ستم ظریفی نے اسے ایک تخت پر لا کر بٹھا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی زندگی ناکام ہو کر رہ گئی اور اس کی شہرت پامال ہو گئی، . . . . . وہ ایک درویش ہو سکتا تھا، گرچہ درویش کے اعلیٰ صفات سے بھی محروم تھا،

[ل] ملنے کا پتہ:- ڈی بی تارپوریوالا، ہارنبی روڈ بمبئی،

لیکن وہ حکمران کی حیثیت سے ایسا بدترین ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ بدتر تصور نہیں کیا جا سکتا ہے"

(اسٹڈیز ان مغل انڈیا جادو ناتھ سرکار ص ۴۳-۶۰)

یہ الفاظ اورنگزیب کے اس سیرت نگار کے ہیں جو محض اس کی سیرت نگاری کی بدولت دنیا میں ہر قسم کے جاہ و ثروت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے، عموماً ایک سیرت نگار ایک ایسی شخصیت کی سیرت نگاری کو موضوع قرار دیتا ہے جو عظیم الشان واقع ہوتی ہے، لیکن یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ فاضل سیرت نگار نے بیس برس کی طویل مدت ایک ایسے حکمران کی سیرت نگاری میں گنوائی" جو ایسا بدترین ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ برا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے، بیس برس کی کدوکاوش اور پانچ جلدوں کی خامہ فرسائی کے بعد ایک سوانح نگار کا اپنے ہیرو کو نالائق، نااہل اور ناکام دکھانا سوانح نویسی کی ایک عجیب و غریب مثال ہے،

مگر ایک حقیقت شناس مورخ کو یہ زیبا نہیں کہ وہ تاریخ کی کسی شخصیت کو برا محض اس لئے کہے کہ وہ اس کے قومی نقطۂ نظر سے برا ثابت ہوا، یہ تاریخ نویسی کے صفاتِ عالیہ کا نہیں بلکہ ایک فرض فراموش مورخ کی جذبات پروری کا مظاہرہ ہوگا، ایک صحیح مورخ کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ عصبیت و جذبات سے آزاد ہو کر تاریخی شخصیتوں کو ان کے حالات، مشکلات اور زمانہ کے اقتضار کے مطابق دیکھنے کی کوشش کرے، پھر وہ جو نتائج مترتب کرے ان میں تاریخیت اور واقعیت ہو نہ کہ قومیت اور عصبیت کی تنگ نظری:

اورنگزیب کے زمانہ کا صحیح مطالعہ اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا ہے، جب تک کہ تیموری خاندان کے تمام ماقبل حکمرانوں کی حکمت عملی کو پیش نظر نہ رکھا جائے، کیونکہ اورنگزیب کے زمانہ کی تمام پیچیدگیاں ایک سیاسی ارتقار کا نتیجہ تھیں جو اس کے اسلاف کی بعض غیر مآل اندیشانہ روش کے باعث ظہور پذیر ہوئیں، اور اسے ایک ناقابلِ انکار حقیقت سمجھنا چاہئے کہ عالمگیری عہد کے تمام انتشار و اختلال کا سبب اکبر تھا

ہندو اکبر کے اس احسان کو فراموش نہین کرسکتے کہ اس نے ان کو مسلمانون کے ساتھ نہ صرف مساویانہ طور پر صف آرا کیا، بلکہ مسلمانون کی ہیبت، سطوت، جبروت اور عزت و وقار کو ان کے دلون سے محو کردیا، عام ہندو جو حاکم قوم کے تمام افراد کو فوق البشر سمجھ کر سر تسلیم خم کرنا اپنا شیوہ سمجھتے تھے اب نہ صرف ہمسری اور ہمچشمی کا دعوی کرنے لگے بلکہ عام طور پر ان سے کھچنے لگے، انکا مذہبی تفوق، عقلی امتیاز اور قومی وقار جاتا رہا، انھی عناصر نے اورنگ زیب کو پیدا کیا جس نے اپنی حکمران قوم کے گم شدہ وقار اور روایات کو سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کی، اتفاق سے اسی زمانہ مین سیوا جی ابھرا جس کی بڑھتی ہوئی قوت سے ہندو قومیت ایک جدید قالب مین آگئی، مگر یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہ اپنی قزاقی، غارتگری اور رہزنی کے باوجود مذہب و سیاست کا بے عدیل ہیرو قرار پایا مگر غریب اورنگزیب اپنی قوم کی تجدید و تشکیل کی مصلحانہ کوششون کی خاطر اتنا برا قرار پایا کہ اس سے زیادہ برا تصور کرنا خود تصور کی اہانت ہے،

ہندو اورنگزیب کی مخالفت محض اس لئے کرتے ہین کہ اس نے ان کی بڑھتی ہوئی قوتون کو آگے بڑھنے نہین دیا، اس نے ان کے محبوب دارا کو تہ تیغ کیا جس کی وسیع المشربی سے انہین ہندو راج قائم کرنے کی امید بندھ چلی تھی، مگر ایک غیر متعصب مورخ کیونکر اس بات کو قطع نظر کرسکتا ہے، کہ اورنگزیب ایک اسلامی حکومت کا مسلمان حکمران ہو، لیکن اسلامی مذہب کا پاسبان، اسلامی شعار کا نگہبان اور اسلامی وقار کا محافظ نہو، اس لئے اگر تمام فرقہ دارانہ ذہنیت سے آزاد ہوکر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اورنگزیب ایک مسلمان بادشاہ تھا جس نے اسلامی حکومت کے کھوئے ہوئے وقار کو قائم کرنے کی کوشش مین تمام ذرائع استعمال کئے تو پھر اس پر کوئی الزام نہین رہتا،

مگر اس کو کیا کیجیے، غیر مسلم فرقہ دارانہ ذہنیت نے اورنگزیب کو ہمیشہ بدترین روشنی مین دیکھنے کی کوشش کی ہے، شروع شروع یہ کام انگریزون نے شروع کیا، اس کے بعد ان کی جگہ ہندو بنگالیون

اور مرہٹون نے لی، ان مین سب سے نمایان جگہ سر جدو ناتھ سرکار نے حاصل کی، انھون نے عالمگیر پر پانچ جلدین لکھ کر اس کی مدلل ہجو و مذمت کا ذخیرہ فراہم کردیا، اس قسم کی غلط فہمیون اور گمراہیون کو دور کرنے کے لئے اردو کے اہل قلم نے برابر کوشش کی، مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے "عالمگیر پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا، پھر دار المصنفین (اعظم گڈھ) کے ایک ممتاز رفیق نے (جواب اسماعیلیہ کالج بمبئی مین پروفیسر ہین) عالمگیریات پر دس سال کی تحقیق و تدقیق کے بعد "رقعات عالمگیر" اور "مقدمۂ رقعات عالمگیر" لکھ کر اردو دان طبقہ کے سامنے پیش کیا، پروفیسر موصوف کی تحقیقات ابھی تک جاری ہین، جو کئی جلدون مین ظاہر ہونگی، پہلی جلد مین صرف عالمگیر کی شاہزادگی کے حالات و واقعات ہین لیکن جس نے اس کی شہزادگی کے حالات کو اچھی طرح سمجھ لیا، پھر اس کو پنجاہ سالہ حکومت کے واقعات پر کچھ بھی استعجاب نہ ہوگا،

لیکن ضرورت تھی کہ اس قسم کے تاریخی لٹریچر ان انگریزی دان غیر مسلمون کے سامنے بھی ہون جو اردو زبان سے ناآشنا ہین، الحمد للہ کہ جناب ظہیر الدین صاحب فاروقی بی۔ اے (علیگ) بیرسٹر ایٹ لا بہرائچ نے اس کمی کو بہت حسن و خوبی کے ساتھ پورا کردیا، ان کی زیر نظر کتاب "اورنگزیب اور اس کا عہد" برسون کی تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے، فاضل مؤلف نے فارسی، عربی، اردو، ہندی، مرہٹی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبان کی ان تمام کتابون اور رسالون سے استفادہ کیا ہے، جو عالمگیر اور اس کے عہد کے متعلق کچھ بھی معلومات فراہم کرتے ہین، اس تلاش و جستجو کے بعد جو کتاب تیار ہوئی ہو وہ ظاہر ہے کہ کس قدر مفید اور کارآمد ہوگی، کتاب چوبیس (۲۴) ابواب پر مشتمل ہے، لائق مؤلف نے ہر باب مین باریک بینی اور دقت نظر سے کام لے کر اورنگزیب کی ذات سے متعلق جو غلط فہمیان عام طور پر پھیلی ہوئی ہین، ان کو کامیابی سے دور کیا ہے، طرز تحریر مین جذبات و کیفیات کی لہرین موجزن نہین بلکہ واقعات کی موشگافی حقائق کی روشنی مین کی گئی ہے،

پہلا باب بہت ہی مبصرانہ اور مورخانہ انداز میں لکھا گیا ہے، ابتدا میں مسلمان حکمرانوں کی جانشینی کے اصول پر مختصر طریقہ سے تبصرہ کرتے ہوئے مؤلف نے بتایا ہے کہ کس طرح ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی تخت نشینی خون آشام رہی ہے، شاہجہان کے بعد پھر وہی تاریخ دہرائی جارہی تھی، دارا حصولِ سلطنت کے لئے تمام ذرائع استعمال کرتا ہے، وہ نہ صرف ملکی مہمات، جزوی معاملات اور خانگی تعلقات میں اورنگزیب کی تذلیل اور تضحیک کر کے باپ کی نظروں سے گرانا چاہتا ہے بلکہ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھ کر اپنے مذہبی اعتقادات اور تصورات کی بھی انہیں کے خیالات کے مطابق رنگ آمیزی کرتا ہے،

مؤلف نے دارا کے عقائد پر بحث کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ وہ کس طرح ہندوؤں کا سیاسی آلۂ کار بننے والا تھا، اکبر کے زمانہ میں اسلام کی سیاسی اور مذہبی ہیئت اجتماعیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا، ہندو اپنی قومیت کی تشکیل اور تکوین کے گھمنڈ میں مسلمانوں کے مدمقابل ہو کر ان کے سیاسی مرکزوں اور مذہبی اداروں پر ضرب کاری لگا رہے تھے، جہانگیر کی نرمی اور لینت نے انہیں اور مواقع دیئے، شاہجہان کے عہد میں دارا کو دیکھ کر وہ خوش تھے کہ ایک دوسرا اکبر پیدا ہو رہا ہے جو ان کے سیاسی مقاصد کی تکمیل میں بہترین معاون ثابت ہوگا،

فاضل مؤلف ان واقعات پر محققانہ روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ "سترہویں صدی کے اواخر کے ردِعمل کے تمام جراثیم اکبر کے اس طرزِ عمل میں پائے جاتے ہیں جو اس نے مسلمانوں کی طرف سے اختیار کیا، ..... اکبر کی رواداری مسلمانوں کے لئے نہ تھی، بلکہ اسے ان کے جذبات کو صدمہ پہنچانے میں لطف ملتا تھا، اس کے الحاد سے مسلمانوں میں شورشیں اور بغاوتیں ظہور پذیر ہوگئیں لیکن اس نے اپنے آہنی پنجوں سے انہیں فرو کیا، مسلمانوں کے جذبات کی اشتعال انگیزی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اکبر ابھی بسترِ مرگ ہی پر تھا کہ جہانگیر سے جس کی تخت نشینی بالکل متیقن نہیں تھی، بارہہ کے سادات نے حلف لیا کہ وہ ہر ممکن کوشش سے اسلام کی عزت و ناموس کا تحفظ کریگا......

شاہجہان کے عہد میں یہ پرانا زخم دارا کے مشکوک اور مشتبہ معتقدات کی شکل میں پھر ابھر آیا، دارا نے ان تمام ذرائع کو استعمال کیا جو اس کے دادا نے کیا تھا، اس صورت حال میں راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اورنگزیب کا نجات دہندہ کی حیثیت سے خیر مقدم کیا، وہ جانتے تھے کہ دارا اکبر کے نقش قدم پر چلیگا، پس اورنگزیب کو اپنے ماحول کا پیدا وار سمجھنا چاہئے، اور اس کی حکومت کے تمام واقعات کو انفرادی طریقہ سے نہیں بلکہ اسباب کے تسلسل کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہئے، اورنگزیب کا عہد شروع سے آخر تک اکبر اور دارا کے غیر مآل اندیشانہ رویہ کے ردعمل سے بھرا ہے" (ص ۵۶)

انہی تاثرات کے ساتھ جانشینی کی جنگ ہوئی، اورنگ زیب چاہتا تھا کہ اگر میدانِ جنگ اس کے ہاتھوں نہیں رہا تو اس کا حشر وہی ہوگا جو ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے حریفوں کا ہوا، مسلمان خوفزدہ تھے کہ اگر دارا فتحیاب ہوا تو معلوم نہیں اس کے مذہبی اعتقادات ان کو کس قعرِ مذلت میں گرائیں گے، حقیقت میں یہ جنگ وہ تھی جس کے نتیجہ پر دو منفرد حریفوں کی قسمت کا نہیں بلکہ دو قوموں کی سیاسی زندگی اور ملکی وقار کا فیصلہ تھا، لیکن اورنگزیب فاتح ہوا اور دارا مفتوح اور مقتول، ہندوؤں کے تمام منصوبے خواب پریشان ہو کر رہ گئے"

یہیں سے ہندو اورنگ زیب سے بدظن ہوتے ہیں، اس کے تمام افعال و اعمال کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اس پر ہر قسم کے الزامات کو وضع کرنا جائز قرار دیتے ہیں، اس انتقامی جذبہ میں وہ نہ صرف اس کی بلکہ اس کے مذہب کی بھی بدترین تصویر کھینچتے ہیں، فاروقی صاحب نے تیسرے باب میں اسلام کا اصلی مرقع پیش کر کے اورنگزیب کا رویہ ہندوؤں کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے، اورنگ زیب پر الزام ہے کہ وہ ہندوؤں کی پرستش گاہوں کو منہدم کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا، مگر فاضل مؤلف نے مختلف قرائن کے ذریعہ سے ثابت کیا ہے کہ اورنگزیب ہندو معابد کے تحفظ کے لئے برابر کوشاں رہا، ان قرائن کی روشنی میں جو دلائل

براہین چوتھے باب مین درج ہین، ان سے بہت سی غلط فہمیان دور ہو جاتی ہین، ایک فرمان جو اورنگزیب نے بنارس کے حاکم کے نام جاری کیا ہے وہ ملاحظہ ہو،

"ابو الحسن کو جو ہمارے احسانات اور مراعات کا مستحق ہے شاہی عنایات پر اعتماد کرنا چاہئے اور اس کو معلوم ہو کہ ہم اپنی طبیعت کی عمیق مہربانیون اور فطری فیاضیون کے سبب اپنی تمام انتھک قوتین اور مخلصانہ ارادے عوام کی بہبودی اور ہر درجہ کے اعلیٰ اور ادنیٰ لوگون کے حالات کی ترقی مین مصروف رکھتے ہین، اس لئے اپنی شریعت کے مطابق ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پرانے منادر مسمار نہین کئے جائینگے، لیکن نئے منادر بنانے کی اجازت نہ ہوگی، ہمارے اس انصاف کے زمانہ مین ہمارے اعلیٰ اور مقدس ترین دربار کو اطلاعات موصول ہوئی ہین کہ بعض اشخاص نے بغض اور عناد سے مغلوب ہو کر بنارس کے ہندوون اور پرانے منادر کے بعض برہمن محافظون پر مظالم کئے ہین، اور وہ آئندہ ارادہ رکھتے ہین کہ ان برہمنون کو ان کے عہدون سے نکال دین، اس ارادہ سے اس قوم مین بے چینی پھیلی ہوئی ہے، اس لئے ہمارا شاہی حکم ہے کہ اس فرمان کے پہنچنے کے بعد تم کو آئندہ ہدایت دینی چاہئے کہ کوئی شخص غیر قانونی طریقہ پر برہمنون اور دوسرے ہندو باشندون کے ساتھ بیجا مداخلت یا ان کو تنگ نہ کرے، تاکہ وہ پہلے کی طرح اپنے پیشون پر قائم رہین، اور سکون کیساتھ عبادت مین مشغول رہ کر ہماری خداداد سلطنت کے قیام کے لئے جو برابر رہیگی دعائین کرین، اسکو ایک ضروری بات سمجھو، تاریخ ۱۵ جمادی الثانی سنہ ۱۰۶۹ھ"

نئے مندرون کی تعمیر کے امتناعی حکم کے نفاذ کی توجیہ مؤلف نے اس طرح کی ہے کہ

"آزادی اور رواداری دونون ہم معنی نہین، رواداری مین احتجاج اور ناراضی کا کچھ عنصر شامل ہے، مندرون اور گرجاؤن کی بلا مزاحمت تعمیر آزادی ہے، ان کا انہدام تعدی ہے، لیکن پرانے مندرون کی مرمت کی اجازت اور نئے کی تعمیر کی ممانعت مشروط رواداری ہے، ہمین اقرار ہے، کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین اور پھر بیسیون مسلمان حکمرانون نے نئے مندرون کے بنانے کی اجازت دی، لیکن فقہاء متاخرین اس کامل آزادی کے نہین بلکہ مشروط رواداری کے حامی تھے" (حاشیہ ۱)

اورنگ زیب پر الزام ہے کہ اس نے بنارس کے کرتی باسیورا، بینی مادھو اور وشوا ناتھ نامی تین مندرون کو مسمار کر کے ان کی جگہ مسجدین بنوائین، پہلے مندر کی جگہ پر جو مسجد بنی وہ عالمگیر کے نام سے منسوب ہوئی، پھر مؤخر الذکر دو مندرون کے کھنڈرون پر جو مسجدین تیار ہوئین ان کا نام علی الترتیب "پنج گنگا" اور "گیان باپی" ہے، لیکن اس سلسلہ مین مؤلف مذکور کی تحقیقات بصیرت افروز ہین، مذکورہ بالا پہلی مسجد ۱۰۷۰ھ مین تعمیر ہوئی جیسا کہ اس کے کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے تمام ہمعصر تاریخون مین سوائے کاشی وشوا ناتھ مندر کے انہدام کے جو ۱۰۸۰ھ مین ہوا کسی اور مندر کی تخریب کا ذکر نہین آتا، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اورنگزیب نے کرتی باسیورا کے مندر کو کیون اور کب ڈھایا، اگر اورنگ زیب نے محض تعصب کی بنا پر مندرون کو مسمار کیا تو ایک کو ۱۰۷۰ھ مین اور دوسرے کو ۱۰۸۰ھ مین کیون برباد کیا؟ بینی مادھو نامی مندر کے سلسلہ مین بھی کوئی تحریری شہادت نہین کہ یہ مندر اورنگزیب کے حکم سے گرایا گیا، گنج ارشدی بنارس کے ایک بزرگ کے ملفوظات ہین، اس کتاب مین ۱۵ جمادی الاول ۱۰۷۹ھ کی تاریخ مین درج ہے کہ "کفار نے ایک مسجد کو شہید کیا جو زیر تعمیر تھی، اور معمارون کو زخمی کیا، جب یہ خبر شاہ یسین کو ملی تو وہ منڈیاؤن سے بنارس آئے اور مسلمانون کو جمع کر کے "بتخانہ کلان" کو مسمار کر دیا" یہ واقعہ آگے چل کر بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ملفوظات کے مرتب اخیر مین لکھتے ہین کہ "نور بافون اور مسلمانون نے قریب پانچسو منادر مسمار کئے، وہ بینی مادھو کے مندر کو بھی برباد کرنا چاہتے تھے، لیکن گلیان مسدود تھین اس لئے وہان پہنچ نہ سکے" "بتخانہ کلان" سے مراد وشوا ناتھ مندر ہے کیونکہ اگر یہ مندر

[1] معارف:- رسول اللہ صلعم سے اس باب مین کوئی شئی نفیاً یا اثباتاً ثابت نہین، صرف حضرت عمرؓ کے معاہدات مین جنکی بڑی قانون کی حیثیت سے کیگئی ہے،

اورنگ زیب کے ہاتھون مسمار کیا جاتا تو گنج ارشدی کا مرتب خوش ہو کر اس واقعہ کا ضرور اندراج کرتا، اس کے علاوہ گیانی بانی کی مسجد کے کتبہ سے پتہ چلا ہے کہ یہ مسجد ۸۴۲ھ مین تعمیر ہوئی، "ایوان شریعت" اس کا تاریخی نام ہے، پھر یہ کہنا کہانتک درست ہے کہ وشوا ناتھ مندر کو مسمار کرکے ۱۰۸۰ھ تک قائم تھا، گیان بانی کی مسجد تعمیر ہوئی، سجان رائے بنارس کے احوال مین کہین ذکر نہین کرتا ہے، کہ اورنگزیب نے کسی ایک مندر کو بھی مسمار کیا، کہا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے مندرون کے مسمار کرنے کے لئے ایک عمومی حکم جاری کر رکھا تھا، لیکن یہ حکم اگر واقعی جاری ہوا تو مغلیہ سلطنت کے پایۂ تخت والی آگرہ، پھر متھرا اور دکن مین جہان اورنگزیب نے جنگ و جدل مین اپنی بیشتر زندگی گذاری، ہزارون مندر کیونکر محفوظ رہے،

اس کے بعد مؤلف نے جزیہ پر بحث کی ہے، پہلے نفس جزیہ کے اصول پر مفید بحث کرکے یہ بتایا ہے کہ اورنگزیب نے یہ ٹیکس محض مالی نقطۂ نظر سے عائد کیا، منو کی اور پھر دوسرے غیر ذمہ دار مورخون کا خیال ہے کہ جزیہ ہندوون کو قبولِ اسلام کی ترغیب دلانے کی خاطر عائد کیا گیا، لیکن "جزیہ ہرگز اس خیال سے عائد نہین کیا گیا، کیونکہ وہ ہندو جو حکومت کے ملازم تھے، اس ٹیکس سے بری تھے یہ برأت اس اصول کو واضح کرتی ہے، کہ یہ ٹیکس ان کے لئے نہ تھا، جو حکومت کے ملکی اور فوجی محکمون مین رہ کر اپنے فرائض ادا کرکے سلطنت کی خدمت کرتے تھے، ایشور داس کہتا ہے کہ "بادشاہ سلامت نے ایک حکم جاری کیا، کہ سلطنت کے ملازمین کے علاوہ غیر مسلم مندرجہ ذیل شرح سے جزیہ ادا کرین، امراء جن کی آمدنی ۲۵۰۰ ہو ۱۳ روپیہ، طبقۂ متوسط جن کی آمدنی ۲۵۰ ہو ۶ روپیہ ۸ آنے، غربا جو اپنی ضروریات پوری کرکے ۵۲ روپیہ یا اس سے زیادہ پس انداز کرتے ہون، ۳ روپیہ ۸ آنے ادا کرین"۔۔۔ جزیہ کبھی ظلم و ستم کے ساتھ وصول نہین کیا گیا، غربا جب اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریات سے فارغ ہو کر مذکورۂ بالا رقم پس انداز کرتے تو ان سے جزیہ لیا جاتا، طبقۂ متوسط کو اجازت تھی کہ وہ دو قسط

مین اور غربا چار قسط مین رقم کی ادائی کرین، وہ روپیہ کے علاوہ دوسری شکل مین بھی اس کی ادائی کر سکتے تھے، اور اگر کوئی چھ مہینے تک بیمار رہتا تو اس سے جزیہ نہ لیا جاتا، یا اگر ایک سال تک حکام کی غفلت کے علاوہ کسی اور باعث سے یہ وصول نہ ہوتا تو دوسرے سال معاف ہو جاتا" (صفحہ ۱۵۲)

کتاب کے چھٹے باب مین ہندوون کے میلون، تہوارون، درسگاہون اور معاشرتی زندگی کے متعلقات اور پھر ان کے سلسلہ مین عالمگیری احکام کی حقیقت کا دلچسپ مطالعہ ہے، اورنگزیب پر الزام ہے کہ اس نے تعصب مذہبی مین ہندوون کے میلے ٹھیلے بند کرا دیئے، مگر یہ الزام خافی خان کی بعض عبارتون کے غلط استدلال سے عائد کیا گیا ہے، لائق مؤلف نے خافی خان کے دو متوازی اقتباسات نقل کرکے بتایا ہے کہ اورنگزیب نے مذہبی میلوں کو نہین بلکہ ان میلون کے غیر شرعی محاصل کو بند کیا، طوالت کے خیال سے ہم ان اقتباسات کو نظر انداز کر دیتے ہین، ناظرین، کتاب زیر نظر کے صفحہ ۱۷۰-۱۷۷ ملاحظہ فرمائین، اس کے بعد سجان رائے اور ہملٹن کی شہادتین پیش کی گئی ہین، جن سے اس عہد مین تہوارون اور میلون کا کثرت سے منعقد ہونا پایۂ ثبوت تک پہنچتا ہے، سجان رائے کے حوالہ سے بعض تہوارون کے بھی کوائف بیان کئے گئے ہین، جن مین ہر قسم کی رنگینیون اور سرمستیون کا مظاہرہ ہوتا تھا، اسی طرح اورنگ زیب کے اس الزام کو کہ اس نے ہندوؤن کے تمام مدرسون کو بند کر دیا یہ دکھلا کر رد کیا ہے کہ عالمگیر نے انہی مدارس کو بند کرایا، جن مین ہندو مسلمان بچون کو اپنے مذہبی علوم سکھلاتے تھے، پھر ساتوین باب مین اس کذب و افترا کو کہ اورنگزیب اسلام کی تبلیغ مین تشدد اور ظلم کرتا تھا، حقائق کی روشنی مین دکھایا ہے،

آٹھوین باب مین لائق مصنف نے طویل فہرستون کے ذریعہ سے دکھایا ہے کہ اورنگزیب اور پھر اس کے اسلاف کے زمانہ مین جو تمام نکتہ چینیون اور مسلمانون کی بیجا طرفداریون سے ماورار سمجھے جاتے ہین، ہندو عہدیدار کتنے تھے، یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ ہفت ہزاری منصب والے

ہندو اکبری عہد مین صرف ایک اور جہانگیر وشاہجہان کے زمانہ مین ایک بھی نہین، لیکن اورنگزیب کی حکومت مین دو تھے، شش ہزاری ہندو اکبر کے زمانہ مین ایک بھی نہین، لیکن اورنگزیب کے عہد مین دو تھے، کیول رام مصنف تذکرۃ الامرا کی دی ہوئی فہرستون سے پتہ چلتا ہے کہ عالمگیر کے عہد مین پنجہزاری ہندو منصب دار پانچ، چار ہزاری پانچ، ۳½ ہزاری چار، تین ہزاری، تیرہ، ۲½ ہزاری پانچ، دو ہزاری سولہ، ۱½ ہزاری ستائیس، اور ایک ہزاری پندرہ تھے، ان مختلف فہرستون اور پھر دوسرے واقعات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب ہندوؤن کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے لحاظ سے ہمیشہ بڑھاتا رہا، ہندوؤن کو اپنی سرکار مین ملازم رکھنے کے سلسلہ مین اس کا خیال تھا، کہ مذہب کو دنیاوی امور کے بیچ مین لانا بے معنی ہے، اور اس قسم کے معاملات مین مذہبی عصبیت کو راہ نہ دینا چاہیئے" (ص ۲۰۲)

اورنگزیب کی فرد قرارداد جرم مین ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی مذہبی راسخ العقیدگی کے جوش مین راجپوتون کی ہمدردی کھودی، راجپوت تیموری حکومت کے دست راست تھے، ان کا الگ ہونا تھا کہ مغلیہ سلطنت مین تزلزل ہونے لگا، راجپوتون کی ناراضی کی وجہ جسونت سنگھ کے لڑکون کے ساتھ برا سلوک قرار دیجاتی ہے، لائق مؤلف نے جسونت سنگھ کے کیرکٹر اور پھر اس کے لڑکون کی جانشینی کے تمام جزوی واقعات پر بحث کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ راجپوتون کے منافقانہ اور غیر مآل اندیشانہ حرکات سے اورنگزیب کو کس قدر اذیت پہنچی، پھر بھی بلند حوصلہ اورنگ زیب نے بقیہ راجپوت قوم سے ویسا ہی سلوک قائم رکھا جیسا کہ ایک مدبر حکمران کو چاہیئے تھا، اگر اورنگزیب نے غدار اور منافق جسونت سنگھ کے لڑکون کو راجہ کا خطاب عطا نہین کیا تو یہی تنہا مثال ہے، لیکن انھی راجپوتون مین جب راجہ بھگوت سنگھ بندیلہ مرا اور اس نے کوئی وارث نہین چھوڑا تو اورنگزیب نے اس خاندان کے افراد کے مشورے سے راجہ ادت سنگھ کو تخت نشین کیا، جگت سنگھ ہاڈا لاولد مرا تو

اورنگ زیب نے اس کی حکومت کی باگ اس کے چچازاد بھائی کشور سنگھ کو دی، جام نگر کا راجہ زبل مرا تو اس کا لڑکا ستر سل گدی پر بیٹھا، زبل کا بھائی کچھ کے راجہ کی مدد سے ستر سل کو قید کر کے خود تخت کا مالک بن بیٹھا، لیکن اورنگزیب نے قطب الدین خان کے نام فوراً فرمان جاری کیا کہ باغیون کو سزا دیجائے اور ستر سل کو اپنی موروثی سلطنت پر قابض کیا جائے، اورنگزیب نے صفدر خان کے منصب کو محض اس لئے کم کر دیا کہ بختاور بھدوریہ کو اس کے دشمنون کے خلاف مدد دیتھی، انھی تعلقات کا نتیجہ تھا کہ دکن کی مہمون مین راجپوت اورنگ زیب کے ساتھ بکثرت شریک رہے، اورنگزیب کے بعد بھی راجپوت مغلون کے قوت بازو بنے رہے، اس کی اولاد مین جو جانشینی کی جنگ ہوئی اس مین راجپوت برابر کے شریک تھے، اودے پور کے رانا اودے سنگھ نے بہادر شاہ سے فرمانبرداری اور اطاعت گذاری کا وعدہ کیا، مہاراجہ اجیت سنگھ والی جودھ پور دست بستہ بہادر شاہ کے دربار مین حاضر ہوا، مابعد عہدون مین بھی راجپوت دولت مغلیہ سے وابستہ رہے، اجیت سنگھ اور جے سنگھ تمام کے تمام تیموری دربارین برابر نمایان رہے، اکثر راجپوتون نے مرہٹون کے خلاف مغلون سے امداد حاصل کی، ۱۷۳۵ء مین خان دوران جب دہلی سے مرہٹون کے خلاف جنگ کرنے کے لئے روانہ ہوا تو جے سنگھ (جے پور) ابھے سنگھ (جودھ پور) اور راؤ درجان سال (کوٹہ) اس کی امداد کے لئے فوج لے کر آگے بڑھے،

ان واقعات کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہانتک صحیح ہے کہ اورنگزیب کی حکمت عملی سے راجپوت تیموریون سے اس طرح برگشتہ ہوئے کہ ان کی برگشتگی سلطنت کے زوال کا باعث ہوئی، اس سلسلہ مین مؤلف اپنی دقت نظر سے جس نتیجہ پر پہنچے ہین، وہ قابل غور ہے، وہ لکھتے ہین کہ، اورنگزیب کی وفات کے بعد تخت طاؤس طاقتور اور مدبر بادشاہون سے محروم ہوگیا، بہادر شاہ کے جانشینون مین اتنی صلاحیت نہ تھی کہ ماتحت ریاستون کی خانہ جنگیون اور ریشہ دوانیون کا سدباب کر سکین، جنگ

راجپوتون کا محبوب پیشہ تھا، تخت دہلی کی طوائف الملوکی مین ملک گیری کیسے ممکن تھی، راجپوتون کو اپنی جنگجوئی اور نبرد آزمائی کے جوہر دکھانے کا موقع جاتا رہا، لیکن ان کی جنگجویانہ فطرت کے لئے کچھ مشغلہ چاہئے تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ انھون نے اپنی تلوارون کو اپنے ہی عزیز و اقارب کی گردنون پر تیز کرنا شروع کیا، حسب معمول وہ تیموری شہنشاہون سے امداد کے طالب ہوتے رہے لیکن وہان بھلا ان کی شنوائی کہان ہوسکتی تھی، حالات نے انہین مجبور کیا کہ وہ اب صرف اپنے گھرون کو محفوظ رکھنے مین مشغول رہین، لہذا تیموری حکومت کی سیاست سے ان کی دلچسپی کم ہوتی گئی، یہ تیموری سلطنت کیلئے مضر ہوا، لیکن راجپوتون کے لئے اور بھی ہلاکت آفرین ثابت ہوا، راجپوت جو تین صدیون تک ہر جگہ ممتاز اور مقتدر تھے، اب اپنے کو ایک مردہ قوم محسوس کرنے لگے، یہان تک کہ وہ بالکل پس پشت ہو گئے (ص ۵۷۵) یہ نتیجہ حقیقت اور واقعیت سے خالی نہین،

دسوان اور گیارھوان باب سکھون اور شیعون پر ہے پھر چار باب مین گولکنڈہ اور بیجاپور کے واقعات پر فاضلانہ تبصرہ ہے، شروع مین گولکنڈہ کے ابتدائی حالات ہین جن مین اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے خلاف یہان کے حکمرانون کی شوریدہ سری اور شورہ پشتی اور سرکشی پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر شاہزادہ اور شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ مین جو واقعات ظہور پذیر ہوئے ان پر مباحث ہین آخر مین مولف نے گولکنڈہ کی تسخیر کے اسباب جو بتائے ہین وہ سننے کے قابل ہین، وہ لکھتے ہین کہ

"اکتوبر ۱۶۸۵ء کی صلح اور مارچ ۱۶۸۶ء مین مادنا کے قتل کے بعد اورنگ زیب کو امید تھی کہ ابوالحسن عقل سلیم سے کام لے کر اب مرہٹون کی دوستی اور استعانت سے گریز کریگا، لیکن یہ امید عبث تھی، ہم دیکھتے ہین کہ صلح کے فوراً ہی بعد ابوالحسن نے ایک کثیر رقم سمبھاجی کو بھیجی، گولکنڈہ کے ہوا خواہ ہر ممکن صورت سے ابوالحسن کو ناخوشگوار نتائج سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے حتی کہ مغل کے شاہی وکیل نے اس خبر کو اورنگزیب سے پوشیدہ رکھا، لیکن اورنگ زیب کو بیرونی ذرائع سے آخر پتہ چل ہی گیا، ابوالحسن بہانہ

کرتا تھا کہ اس کے پاس اب روپیہ نہین ہین، اور عوام کی ہمدردی کو منعطف کرنے کی خاطر اس نے شاہی قاصدسے روپیہ کے بدلے بیگمات کے جسم پر سے زیورات اتار لینے کی درخواست کی، لیکن سمبھاجی کے پاس روپیہ بھیجنے کے لئے کافی روپیہ تھے،

"حیدرآباد کی فتح کے سلسلہ مین خافی خان نے اورنگ زیب کی بیجاپور سے گلبرگہ اور پھر یہان سے گولکنڈہ کی روانگی کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ اس اچانک حملہ کے اسباب کو نظرانداز کر گیا ہے، اس سے لازماً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اورنگزیب جارحانہ طور پر صلح کے معاہدون سے دست بردار ہوگیا، لیکن شاہی قاصد سعادت خان کے تذکرے مین مصنف مذکور اتفاقی طور پر اس اچانک حملے کا سبب بتا گیا ہے، یعنی مرہٹون کے ساتھ ابوالحسن کی سازش جو قطب شاہی سلطنت کے استیصال کی حقیقی وجہ ہے،

"اورنگ زیب گولکنڈہ کی طرف بڑھا جہان وہ ۱۶۸۷ء کی آخیر جنوری مین پہنچا، گولکنڈہ کا محاصرہ طویل ہوگیا، کیونکہ مغل افسرون مین نفاق پھیلا ہوا تھا، گو ان کی وابستگی شاہی بہبودیون سے تھی لیکن اورنگ زیب کے شیعہ امرار ایک شیعہ سلطنت کے استیصال پر بے حد مغموم تھے، ان کے جذبات فطری تھے اور انھون نے اس مصیبت کے سدباب کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن گولکنڈہ کے ایام پورے ہوچکے تھے، اورنگ زیب اپنے ارادون مین پختہ اور مستقل تھا، ابوالحسن نے رحم کی درخواست کی لیکن اورنگزیب اپنے عزم سے کیون باز آنے لگا، اس نے ابوالحسن کو لکھا کہ "تمھارے جرائم ناقابل بیان ہین، تم نے اپنا نظام سلطنت ایک کافر (یعنی مادنا) کے سپرد کیا اور پھر اسے سادات، مشائخ اور علماء پر مظالم کرنے مین مدد پہنچائی، شب و روز تم میخواری مین مست رہتے ہو، ہر قسم کی بدمعاشیان تمھارے یہان پھیلی ہوئی ہین، تم کفر و اسلام اور ظلم و انصاف مین مطلق امتیاز نہین رکھتے ہو، تم کفار یعنی مرہٹون کے امداد پہنچانے پر اب تک مصر ہو، . . . . تمھارے پاس متعدد فرامین پہنچے، لیکن تم نے سبھون کو نظرانداز کردیا، پھر تم نے حال ہی مین ایک لاکھ ہون (چار لاکھ روپیے) بدطینت سمبھا کے پاس بھیجا، اپنی ان ناروا حرکتون

سے غافل ہوکر تم دونون جہان کی بہبودیوں کے خواہان ہو تو یہ محض سراب اور دھوکا ہے ؎

ان حالات مین اگر اورنگزیب نے گولکنڈہ کو تسخیر کیا تو کیا برا کیا؟

اسی طرح عالمگیر نے بیجاپور کو فتح کرکے کیون اپنے ممالکِ محروسہ مین شامل کرلیا، اس کا جواب مؤلف کے الفاظ مین یہ ہے:-

"بیجاپور کی اصلی عظمت محمد عادل شاہ متوفی ۱۶۵۶ء کے بعد سے جاتی رہی، علی عادل شاہ دوم نے شروع مین انتظامی صلاحیت کا ثبوت دیا، لیکن آگے چل کر وہ زن وشراب کے مضرت رسان اثر مین آکر برباد ہوگیا، اس کی وفات (۱۶۷۲ء) تک بیجاپور کا اجتماعی وجود قائم تھا، لیکن اس کے بعد طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا، امراء اپنے اقتدار کے لئے برسرِ پیکار رہنے لگے اور اپنی غیر مناسب خودغرضانہ مطلب برآری کے لئے عادل شاہی سلطنت کا شیرازہ بکھیرنے کے لئے تیار رہتے، ظلم اور رشوت ستانی کا دور شروع ہوا، انصاف کا فقدان ہوگیا، بیجاپور کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ کسی کو بھی خواہ وہ ایک شہزادہ ہو یا ادنیٰ کسان، ایک دن بھی اطمینان سے کھانا یا رات کو سونا نصیب نہ ہوا، اس شورانگیز حکومت کے علاوہ سلطنت کی بیرونی حکمت عملی نہایت مضر ثابت ہورہی تھی، مرہٹے بیجاپور کے حدودِ سلطنت کو آزادی سے غصب کررہے تھے، لیکن ان کو روکنے کی کوئی صورت عمل مین نہین لائی جارہی تھی، برخلاف اس کے ان کی خدمات ہمیشہ حاصل کیجاتین، حالانکہ وہ غداری کرنے کے سوا اور کوئی فائدہ نہین پہنچاتے، اہلِ بیجاپور مغلون سے معاہدے کرتے اور مرہٹون کو امداد نہ پہنچانے کا وعدہ کرتے تھے، لیکن ان کے وعدون مین اصلیت مطلق نہ ہوتی تھی، انھون نے اورنگزیب کو دھوکا دینے کی کوشش کی، لیکن خود دھوکے مین آگئے"۔

"اہلِ بیجاپور کے لئے صرف دو چارۂ کار تھے، یا تو وہ علانیہ اور آزادی کے ساتھ سیواجی سے مل کر مجموعی فوجون سے مغل حکومت کو دھمکی دیتے یا پھر خلوص دل سے مغلون کے ساتھ ہوکر مرہٹون کو انکے

مقبوضات سے بے دخل کرنے کی کوشش کرتے، لیکن انھون نے ایک مہلک رویہ اختیار کیا، ظاہراً مغلون سے ملے رہے، لیکن باطناً مرہٹون کو امداد پہنچاتے رہے، مغل سلطنت خطرے مین تھی، مرہٹون کی قوت بڑھ رہی تھی، جب بیجاپور کے امراء نے مغل بادشاہ کے نصائح سے کوئی فائدہ نہین اٹھایا تو سزا ہوش ربا سرعت کے ساتھ نازل ہوئی اور نوجوان سکندر کو اپنے خودغرض اور بدچلن مشیرون اور رویون کی حماقتون کا خمیازہ بھگتنا پڑا" (ص۳۴۷)

عالمگیر پر یہ اعتراض ہے کہ اگر وہ گولکنڈہ اور بیجاپور کو فتح نہ کرتا تو دکن کی یہ ریاستین مرہٹون کو دبائے ہوئے رہتین، مگر حقائق کی روشنی مین یہ اعتراض کس قدر بے بنیاد ہے، سچ تو یہ ہے کہ جیسا کہ مؤلف نے بھی لکھا ہے کہ حیدرآباد اور بیجاپور کے انتشار واختلال، ان کی خانہ جنگیون اور امراء کی ریشہ دوانیون کا بس یہی نتیجہ ہوتا کہ دونون ریاستون پر مرہٹون کا علم لہراتا ہوتا، مغلون کے خلاف مل کر ایک مشترک دشمن کو شکست دینے کے بجائے سلاطینِ دکن نے مرہٹون کی مدد کی، ایسی حالت مین اورنگزیب ان کے استیصال کے لئے کیون آمادہ نہ ہوتا؟

ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ہونہار اور لائق مصنف نے لکھا ہے کہ "اس بدقسمتی کا کیا علاج ہوسکتا ہے کہ وہی چیز جو تمام حکومتون اور فرمانرواؤن کے لیے طرۂ امتیاز اور تمغائے افتخار ہو، وہی کاروائیان جو سلاطین اور کشورکشاؤن کے حالات مین کارنامے کہے جائین، غریب اورنگزیب کے لئے ذلت وبدنامی، رسوائی وشرمساری کا موجب ہون، رومیون نے قدیم دنیا کے تینون براعظمون کے بیشتر حصہ کو اپنے گھوڑون کی ٹاپون سے کچل دیا، لیکن یہ ان کی عظمت وشوکت کا سبب بن گیا، سکندرِ اعظم نے مقدونیہ سے لیکر پنجاب تک تمام متمدن ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لیکن یہی بربریت اس کی بڑائی کا ذریعہ ہے، دور کیون جایئے خود مغلون کے سب سے زیادہ نیکدل، غیر متعصب وسیع المشرب بادشاہ اکبر نے بہار وبنگال، مالوہ وگجرات اور راجپوتانہ کو ہضم کرکے زبدہ پارکی

مسلم ریاستون پر حملہ کیا اور خاندیس، برار اور احمد نگر وغیرہ پر قبضہ کیا، اس غاصبانہ قبضہ کا صلہ کیا تھا؟ کوئی مخالفانہ تنقید، کوئی غیر منصفانہ فیصلہ نہین، بلکہ اسے اعظم کا خطاب دیا گیا، جہانگیر و شاہجہان نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتون سے تمام عمر لڑتے رہے ہین تو مورخون کے کانون پر جون تک نہین رینگی، لیکن جب اسی نامکمل و ناتمام کام کو اورنگزیب مجبوراً پورا کرتا ہے تو اُسے ظالم، غاصب، غیر سیاست دان اور متعصب کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے" (مقدمہ رقعات عالمگیر نوشتہ سید نجیب اشرف ندوی ام اے دار المصنفین اعظم گڈھ)

سترھوان اور اٹھارھوان باب مرہٹون پر ہے، ان دو ابواب مین تاریخی حقائق سے ثابت کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب اور مرہٹون مین سے کون غالب اور کون مغلوب رہا، اس سلسلہ مین جو چیز زیادہ دلچسپ نظر آتی ہے وہ سیواجی کے متعلق مؤلف موصوف کی رائے ہے، وہ لکھتے ہین کہ "اس دن سے جب کہ سیواجی نے ایک سترہ برس کے لڑکے کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا، اور اپنے مرنے کے آخری روز تک جب کہ وہ ایک وسیع مملکت اور مستحکم قلعون کا بلاشرکت غیرے مالک تھا، اس نے اپنے دوست اور دشمن کے تصورات کو یکسان طور پر ورطۂ حیرت مین ڈال رکھا تھا، وہ طاقتور ہمسایون سے گھرا ہوا تھا لیکن اس نے پہلے احتیاط اور ہوشمندی سے ایسا کام لیا کہ انہین اس کی ذات سے مطلق خطرہ کا احساس پیدا نہین ہوا، لیکن جب وہ ناقابل تسخیر قلعون کا مالک بن بیٹھا تو پھر اپنی بڑھتی ہوئی قوت کی بنا پر اپنی اہمیت دکھانے لگا، چالاکی اور ڈپلومیسی مین اپنا ثانی نہین رکھتا تھا، پھر اہم مواقع کی پیچیدگیون سے کبھی پراگندہ خاطر نہین ہوتا تھا، وہ اپنی ہر ضرورت کے لئے ایسے شاندار ذرائع پیدا کر سکتا تھا کہ غنیم بھی اس کی مداحی مین رطب اللسان ہو جاتے تھے، جب کبھی وہ کوئی تدبیر سوچتا تو اپنی حیرت انگیز چالاکی سے اس کو عملی جامہ اس خوبی سے پہنا دیتا تھا کہ اغیار کی تمام پیشقدمی یونہی مدہم پڑی رہتی تھی، وہ بجلی کی طرح آتا اور گذر جاتا تھا، اس کی آمد و رفت مین اتنی حیرت انگیز

سرعت ہوتی کہ لوگ قبل اس کے کہ اس کی آمد کے اثرات سے سنبھلین وہ غارتگری کا صرف منظر پیچھے چھوڑ کر بیسیون میل آگے بڑھ جاتا، اس کو اپنے دشمنون کے کمزور پہلو سے واقفیت حاصل کرنے مین مہارت تامہ تھی، وہ اپنے غنیمون کی طبیعتون اور دلچسپیون سے اس طرح کی واقفیت بھی رکھتا تھا کہ اس کے ذریعہ سے انہین پسپا کرنے مین اسے کچھ بھی دقت محسوس نہ ہوتی تھی، اسکو لڑائی مین نمایشی اجزا کی عملیت کا کافی احساس تھا، اس لئے اس کا شایستہ خان پر حملہ کسی اہم مقصد کی تکمیل کے لئے نہین بلکہ محض ہیبت طاری کرنے کے لئے تھا، وہ ایک TOWERING شخصیت کا آدمی تھا، ایک ابلق گھوڑے پر بیٹھکر اپنے ہاتھ مین ایک لمبی تلوار لے کر نہ صرف اپنی اطاعت تسلیم کراتا، بلکہ لوگون سے غیر متزلزل وفاداری اور کمال نیاز حاصل کرتا، دلیری اور جوانمردی مین اس کے مد مقابل بہت کم لوگ تھے، اس کا غیر متزلزل استقلال، ناقابل شکست ہمت، اسکی اعلی امتیازی قوت، اس کی ذہنی سرگرمی کی فوقیت اور تدابیر کی تکمیل مین ناقابل یقین کارنامے ہم سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہین رہ سکتے"۔

اس کی ذات کی بدولت مرہٹون نے تمناؤن اور امیدون کی پرورش کی، اور اپنے خواب و خیال کے اجزا تیار کئے، اس نے ہندوستان کی تاریخ مین ایک جدید عہد پیدا کیا، اور اپنی قوم کی قسمت بدل دی، سیواجی کی زندگی واقعۃً ایک رزم تھی" ص ۳۶۷،

ممکن ہے کہ مؤلف کی اس رائے سے بعض اہل نظر متفق نہ ہون، لیکن ایک مورخ کا فرض ہے کہ وہ تاریخ کی ایک شخصیت کے روشن پہلو کو نظر انداز نہ کرے خواہ اس کی زندگی ناخوشگوار واقعات سے کیون نہ مملو ہو

اگلے چار بابون مین ملکی نظام اور سیاسی و معاشرتی حالات کا دلچسپ، مفید اور پر از معلومات مطالعہ ہے، تئیسوان باب اورنگ زیب کے ذاتی حالات پر ہے، جس مین اس کی ایام شاہزادگی، تعلیم و تربیت، متاہل زندگی، سیرت، انفرادیت، ہمت، استقلال، احساس فرائض، انصاف، افتاد طبیعت اور عمال حکومت

کے ساتھ اس کے برتاؤ پر تبصرہ ہے، ان تمام باتون پر ناقدانہ نظر ڈال کر فاضل موصوف جس نتیجہ پر پہنچے
ہیں وہ یہ ہے کہ دیرینہ کامیابیوں اور ناکامیوں کی صدائے بازگشت مفقود ہوگئی ہے اور ایک نئی د
ظہور مین آگئی ہے، لیکن اورنگ زیب کی یاد مسلمانون کے دلوں میں اب تک قائم ہے، اور ایک جلیل الق
انسان کی حیثیت سے وہ غیر فانی ہے:

اقبال نے خوب کہا ہے،

کور ذوقاں داستانہا ساختند وسعتِ ادراکِ او نشناختند
درصفِ شاہنشہاں یکتا ستے فقرِ او از تربتش پیدا ستے

تتمہ میں مؤلف نے اورنگزیب کے عہد کے تمام واقعات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے تیموری سلطنت
کے زوال کے اصلی اور حقیقی اسباب پر روشنی ڈالی ہے، جن بلیغ سطرون پر کتاب ختم کی گئی ہے، وہ قابل
مغل اب باقی نہیں رہے، ان کے پرچم دہلی کے لال قلعہ کے برجوں پر اب نہین لہرائین گے
تخت طاؤس کی درخشانی سے دیوان عام کا شاندار کمرہ حسین نظر نہیں آئیگا، اس کی مرصع دیوارون مین
جن سے اب صرف خالی الذہن منظر میں سیاحوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں، بادشاہوں کی صدائین نہین
گونجینگی؛ دنیا عظیم الشان مغلوں کی شان وشکوہ اور جاہ وجلال کو نہیں دیکھیگی، لیکن آیندہ نسلین جب
ان کے تمدنی اثرات، ان کے قوانین کی یکسانی، ان کی بدولت علم وادب کی ترقی، ان کے عہد کی
اقتصادی بے نیازی پر غور کرینگی تو معلوم ہوگا کہ ان کے قبل ہندوستان کے غربا کے تحفظ، تجارت وزرا عت
کے فروغ، امن وامان کے قرار، اور عوام کے آرام وآسایش کی خاطر ایسی منظم اور سرگرم کوششین نہیں کی گئین
مغل حکومت کے آثار صرف دفتر پارینہ میں محفوظ نہیں، بلکہ موجودہ عہد کے فرہنگ میں واضح طور پر پائے جاتے
ہین، ہمارے مالی اور عدالتی محکموں میں ایسے بکثرت اصطلاحات مروج ہیں، جو پرانے نظام کے اثرات کی یا
تازہ کرتے ہیں، اگر یہ باقیات الصالحات خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن گذشتہ عہد کی فراوانی اور تنوع کی تعبیر کوئی ا

کیونکر کرسکتا ہے، ہم نے اپنی آنکھون پر زور دیا کہ ہم مغلوں کے جہاز کو مع اس کے سردار اور جہاز رانوں کے
بحری موجوں سے گذرتے ہوئے دیکھیں اور اپنے ناظرین کو اس کا منظر دکھائین، لیکن یہ کام ہمارے بس سے
باہر ثابت ہوا، ساحل پر جب وقت کا جہاز اپنے تباہ شدہ اجزا چھوڑ جاتا ہے، تو ہم ٹوٹے پھوٹے تختون
اور لکڑیوں کو جمع کر لیتے ہیں، جن پر بحثیں کی جاسکتی ہیں، مگر ان میں زیادہ تر قیاس آرائیاں ہوتی ہیں، لیکن
وہ عظیم جہاز جو عمق میں غرق ہوگیا گیا تھا، اس کو ہم پھر کبھی نہیں دیکھین گے"

آخر میں ایک بار پھر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مؤلف نے جس وسعتِ نظر، تلاش وجستجو اور تفحص
وتجسس سے کام لے کر ایک دیرینہ ضرورت کو پورا کیا ہے، وہ ہر لحاظ سے مدح وستایش کے قابل ہے
سچ تو یہ ہے کہ اورنگزیب کی ذات پر جادو ناتھ سرکار کی زہر چکانیون کے بعد ظہیر الدین فاروقی صاحب
کی یہ کتاب تریاق کا کام کرے گی، اس لئے ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ ذوق اور طلبہ
کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے،

مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر

اس مین رقعات پر مختلف حیثیتون سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشا اور
شاہانہ مراسلات کی تاریخ ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہین،
بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء، اور اس کی تاریخ کے مآخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک
کے تمام واقعات وسوانح پر خود ان خطوط ورقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے،

لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ ضخامت ۴۰۷ صفحے، قیمت: للعہ

"منیجر"

عربون کا علمِ کائنات

از

جناب صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور،

(۲)

عربی علم ادب مین عرب جغرافیہ نگارون کے ساتھ ساتھ ماہرین علم کائنات ہوئے ہیں، جنھیں حقیقت مین تشریحی جغرافیہ کا ماہر کہنا بجا ہوگا، یہ لوگ ایسے مخزن العلوم تھے، کہ وہ نہ صرف زمین کی حالت اور اوس کے ممالک کا ذکر کرتے ہیں، بلکہ تمام کائنات اور اسکی مختلف النوع حالتون کو بھی بیان کرتے ہین، وہ علم کلام، فلسفہ اور فطرت کے ماہر بھی ہین، اور جغرافیہ نگار بھی، انھیں ہر شے سے انس ہے، اور وہ اس کی جستجو مین رہتے ہین، اور بالآخر حاصل کر لیتے ہین، ان کی تصانیف کیا ہین، مجموعۂ عجائب ہیں، شاید اس سے یہ خیال پیدا ہو کہ ان کتابون کی علمی حیثیت بہت کمزور ہے، نہیں یہ بات ان پر ہمیشہ صادق نہیں آتی، انکی تصانیف مین ان تمام افسانون اور حکایات کے ساتھ ساتھ ایسا مفید علمی مواد بھی ہے، جو ہر لحاظ سے قابل مطالعہ ہے، اور کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ یہ عجائب ایسے واقعات پر مبنی ہوتے ہین، جنکی یا تو مناسب تکمیل نہ ہو سکی ہو، یا ان کے بیان کرنے مین کچھ فرق پڑ گیا ہو، علاوہ برین یہ تمام کتابین عام دلچسپیون کا مجموعہ ہین،

قزوینی، علم کائنات پر لکھنے والون مین سب سے مشہور قزوینی اور دمشقی ہیں، قزوینی واسط اور حلہ کا قاضی تھا، اوس نے ۶۸۲ھ مین وفات پائی، اس کی کتاب کو وسٹنفلڈ نے شائع کیا ہے، اس کے

دو بڑے حصے ہین، ایک مین اس نے کائنات کے عجائب کا ذکر کیا ہے، اور اس مین مشہور ستارون، آسمان کے نگران فرشتون کا ذکر اور ان مین سے بعض کا حال تفصیل سے لکھا ہے، علاوہ برین اس حصے مین دنون مہینون اور دوسری مشہور چیزون کا ذکر ہے، اس کے بعد وہ حصہ ہے، جسے صحیح مفہوم مین علم الارض کہنا چاہیے، اس مین سمندرون کا بیان بھی شامل ہے، سمندرون کے ذکر کیساتھ جزائر اور وہان کے حیوانات کے حالات بھی درج کیے ہیں، سمندرون کے بعد پہاڑون کا بیان ہے، جسے وہ ترتیب ابجد کے لحاظ سے لیتا ہے، پھر دریاؤن، چشمون اور دیگر ذرائع آب کا حال اسی ترتیب سے لکھا ہے، کتاب کے اس جغرافی حصے کے بعد معدنیات کا بیان ہے، جس مین ارسطو کا ذکر بار بار آیا ہے، بعد ازین نباتات کو لیا ہے، جسکی تفصیل بہت وسیع ہے، پھر علم تشریح الاعضاء کی باری آتی ہے، جس مین انسان کے جسم کے ہر عضو پر علیحدہ علیحدہ مقالہ تحریر کیا ہے، ازان بعد نفس انسانی اور اوسکی مختلف کیفیات وواردات کی توضیح فلسفیانہ رنگ مین کی ہے، آخر مین حیوانات کا بیان ہے، اور اسی پر پہلے حصے کا خاتمہ ہو جاتا ہے،

دوسرا حصہ بھی پہلے حصہ کی طرح ضخیم ہے، اس مین مختلف ممالک کا حال آب و ہوا کے اعتبار سے ترتیب ابجد مین ہے، بحیثیت مجموعی یہ کتاب اپنے وقت مین نہایت قابل قدر ہے، اور اس عہد مین جب کہ یہ لکھی گئی، مغرب کی کوئی کتاب اس موضوع پر اس کا مقابلہ نہین کر سکتی، پڑھنے مین نہایت دلچسپ ہے، اس نے مشرق مین خاصی کامیابی حاصل کی ہے، اسکے تراجم، فارسی، عثمانی، اور ترکی زبانون مین ہو گئے ہین، جو بہت مشہور رہین،

دمشقی، اس موضوع پر دمشقی کی کتاب اگرچہ کم اہمیت رکھتی ہے، تاہم دلچسپ ضرور ہے، اس کتاب کو مہرن نے شائع کیا ہے، اس کی ابتدا مین علم الارض کے متعلق عام خیالات کا اظہار ہے، پھر معدنیات اور قدیم مندرون، دریاؤن، چشمون، پہاڑون اور سمندرون کا ذکر ہے، اسکے بعد مختلف ممالک کا حال درج

کیا ہے، معدنیات کا حصہ بالخصوص قابلِ قدر ہے،

دمشقی ربوہ کا امام تھا، جو دمشق کے گرد و نواح میں ایک گاؤن ہے، اس کی وفات ۷۲۷ھ میں کوہ تابور کے قریب صفاد میں ہوئی، قمری سال کے حساب سے اسکی عمر ۷۳ سال[1] کی تھی،

ریت اور پہاڑون کی تولید و تکوین،

اس کتاب کے دونوں حصوں کے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، جن میں اس نے ریت اور پہاڑون کی تولید و تکوین پر بحث کی ہے، وہ لکھتا ہے، :-

"قدما نے اس بارے میں لکھا ہے، کہ سطحِ ارض پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کے ہونے کی وجہ وہ زلزلے ہیں، جو وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں، ان زلزلوں کا باعث یہ ہوتا ہے، کہ زمین کے نیچے جو ہوا ہوتی ہے، جب تموج میں آتی ہے، تو زمین کے بعض حصّون کو بلند اور بعض کو پست کر دیتی ہے، اس کی شہادت میں ایک واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے، جو ۷۲۳ھ میں وقوع پذیر ہوا، اس سال دمشق میں بارش کم ہوئی، اور چشمے سوکھنے لگے، یہان تک گرمی کے موسم میں خدائے عز و جلّ نے زلزلہ بھیجا، جس سے چشمے جاری ہوگئے، اور نہروں میں گُنا اور چوگنا پانی بہنے لگا، اور اس بات کا ثبوت کہ تیز ہوا جب زمین پر چلتی ہے، تو اس سے روئے زمین پر بعض حصّوں کی خاک اڑا اڑا کر ان کو تبدیل کر دیتی ہے، یہ ہے کہ ۷۱۹ھ ہجری میں ہوا کے زور سے جبل عقرع پر سے زیتون کا ایک مضبوط درخت اس تودۂ خاک کے ساتھ جہاں وہ اُگا تھا، نکل کر دور فاصلے پر جا ٹھہرا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ اسکی جڑین ایک عرصۂ دراز سے اس جگہ مستحکم ہو چکی ہیں، اور پہاڑ پر کبھی کوئی درخت موجود نہ تھا،"

چند سطرون کے بعد دمشقی پھر ایک جگہ ایک مغارہ کا ذکر کرتا ہے، :-

"اور عجائب میں سے شام کے علاقہ میں ایک مغارہ ہے، جس میں سے پانی کی ایک ندی

[1] معارف :- یہ صحیح نہیں، دمشقی کی تاریخ ولادت ۳ر شوال ۶۵۴ھ اور وفات وسط ۷۲۷ھ ہے،

بہتی ہے، اس میں عورت داخل نہیں ہوسکتی جب مرد اندر جاتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کے اندر چار ہزار فٹ تک پھیلا ہوا ہے، اور اسکے ہر چہار جانب اور اوپر سے پانی نکل رہا ہے، اور جہاں پانی گر رہا ہے، وہان بہت سے پتھر مختلف صورت اور رنگ کے پڑے ہیں، ان میں سے بعض کی ہیئت پھلون کی سی، بعض کی انسانی اعضاء کی سی ہے، بعض حبوب کی شکل کے ہین، ان کے صاف شفاف رنگ سُرخ سیاہ وغیرہ وغیرہ ہین،"

زلزلے،

دمشقی کے اندازِ تحریر میں خاص سادہ پن پایا جاتا ہے، اور اس سے صحتِ واقعات میں فرق بھی نہیں آتا، قزوینی کا رنگ جداگانہ ہے، دیکھئے وہ زلزلوں کا حال کیسے بیان کرتا ہے، اسکی عبارت میں زمین کی اندرونی حرارت اور بخارات کے تموج اور شدت کا ذکر نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ بخارات زمین کے اندر کثرت سے جمع ہوتے رہتے ہیں، جب اوپر کی زمین سخت ہو اور وہ آسانی سے باہر نہ آسکتے ہون، تو اُن کے اُبھرنے سے زمین میں لرزش پیدا ہوتی ہے، اور اس ارتعاش کا نتیجہ زلزلہ ہوتا ہے، اس کی یہ وجہ ہوتی ہے، کہ حرارت کے باعث گرم اجسام مرتعش ہو جاتے ہین،

اصل حقیقت یہ ہے کہ ان بخارات میں جو نمی ہوتی ہے، وہ حرارت کے باعث اجسام کے مختلف مساموں سے خارج ہوتی ہے، اور اس سے اجسام میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے، جبتک یہ تمام بخارات خارج نہ ہو جائیں، یہ ارتعاش جاری رہتا ہے، اسکے خارج ہو جانے کے بعد اجسام سکون پذیر ہو جاتے ہین، زلزلے میں زمین کے ارتعاش کی یہی وجہ ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمین کا وہ حصہ جہاں یہ بخارات جمع ہو گئے ہون، پھٹ جاتا ہے، اور بخارات باہر نکل پڑتے ہیں، کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ یہ بخارات ایسی جگہ پھوٹ پڑتے ہیں، جہاں آبادی ہو، تو اس حالت میں یہ اُس آبادی کو احاطہ کر لیتے ہیں،

بعض اوقات زمین کے اندر کچھ گڑھے ہوتے ہیں، اور جب زمین پھٹتی ہے، تو خدا کی قدرت سے دوبارہ ان گڑھوں میں جا پڑتی ہے، زلزلوں کا ایک باعث یہ بھی سمجھا جاتا ہے، کہ پہاڑوں کے کچھ حصے زمین پر گرتے ہیں، اور اُسوقت اس زور کا دھماکا ہوتا ہے، جس سے گرد و نواح میں میلوں تک کی زمین کانپ اٹھتی ہے، باقی اللہ بہتر جاننے والا ہے، (واللہ اعلم)

چٹانوں کی تکوین

اس موضوع کا بقیہ حصہ بھی بہت دلچسپ ہے، اس میں پہاڑوں کے پھٹنے، دوبارہ بننے کا ذکر بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے، اور ساتھ ہی ہموار وادیوں کی قدرتی ساخت پر اظہار خیالات کیا ہے، پھر دکھایا ہے کہ ہموار وادیاں کیسے پہاڑوں، براعظموں اور سمندروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اور اسی طرح اُس کے برعکس کیسے عمل ہوتا ہے، اسی سلسلہ میں چٹانوں کی تکوین کے متعلق لکھتا ہے :-

"کہا جاتا ہے کہ آب و گل کی آمیزش کے بعد جب اس پر دیر تک سورج کی گرمی پڑتی رہتی ہے، تو وہ پتھر بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آگ کی حرارت سے اینٹیں بنا لیتے ہیں، خشت بھی ایک قسم کا پتھر ہے، اگرچہ اس میں اتنی پختگی نہیں آتی، جسقدر حرارت کا اثر زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ پتھر کے قریب تر ہوتی جائے گی، چنانچہ اسی عمل کے ماتحت چٹانیں معرض وجود میں آتی ہیں، اب رہا یہ سوال کہ ان میں نشیب و فراز کیسے پیدا ہو جاتا ہے، تو اسکی وجہ بھی زلزلہ ہے جس سے زمین کے بعض حصے دب جاتے ہیں، اور بعض اُبھر آتے ہیں، اسی سلسلہ میں یہ بلند حصہ زمین سورج کی پیہم حرارت سے سخت ہو کر پتھر کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اس نشیب و فراز کی ایک وجہ شدید ہوا کا عمل بھی ہو سکتا ہے، جو زمین کے مختلف طبقوں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پھینک آتی ہو، اور جگہ کو ناہموار کر دیتی ہے، اسکے بعد زمین کے بلند طبقے سخت ہو کر چٹانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں،

اعتدال لیل و نہار

اس موقع پر قزوینی اعتدال لیل و نہار، اور اُس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"بطلیموس کا خیال ہے کہ ہر ۳۶۰۰۰ سال کے بعد سیارے منطقۃ البروج کو طے کر لیتے ہیں جب اس نظام میں فرق آجائے، تو ستارے بھی اپنا رُخ بدل دیتے ہیں، اور ان کی شعاعیں ایک دوسری انداز سے زمین پر پڑتی ہیں، دن اور رات کی طوالت میں فرق آجاتا ہے، اور موسم میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے، آبادیاں ویرانے اور ویرانے آبادیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں"

ستاروں کا اثر ہیئت ارض پر

قزوینی کا یہ بھی خیال ہے کہ ستارے سطح ارض کی ہیئت کو متغیر کر سکتے ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"پہاڑوں کی سطح اس واسطے صاف اور ہموار ہو جاتی ہے کہ سورج، چاند، اور ستاروں کی شعاعیں پیہم ان پر پڑتی رہتی ہیں، ان شعاعوں کے اثر سے پہاڑوں کی نمی بخارات کی صورت میں خارج ہوتی رہتی ہے، اور پہاڑ خشک ہو جاتے ہیں، ان کی چوٹیاں اوپر سے پھٹ جاتی ہیں، اور پتھروں اور ریتوں میں ظاہر ہوتی ہیں، پانی ان پتھروں اور ریت کو بہا کر اور دامن کوہ میں لا کر وادیوں اور دریاؤں کی تہ میں ڈال دیتا ہے، پانی کا بہاؤ ان چیزوں کو وہاں سے بہا کر جھیلوں میں ڈال آتا ہے، وہاں جا کر یہ چیزیں تہ میں بیٹھ جاتی ہیں، یہاں تک کہ ایک طبق کے اوپر دوسرا طبق قائم ہو جاتا ہے، بالآخر ان کی صورت بھی وہی ہو جاتی ہے، جو ہوا سے بنے ہوئے ریت کے ٹیلوں کی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ہم پتھروں کو توڑ کر دیکھیں تو ان کے اندر مونگے، ہڈیاں پائی جاتی ہیں کیونکہ جس مٹی سے وہ بنے تھے، اُن میں یہ چیزیں موجود تھیں، پہاڑوں میں بھی جو طبقات

نظر آتے ہیں، انکی وجہ بھی یہی ہے"

علم ارض کے ان ماہرین کے یہاں بعض ایسی باتیں موجود ہیں، کہ وہ تاریخِ علوم کیلئے بے حد مفید ہیں، شہروں اور ملکوں کے حالات لکھتے وقت وہ بعض ایسی دلچسپ تفصیلات بیان کر جاتے ہیں، جو تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں،

دیوانِ شمس تبریز اور مولینا روم

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ فارسی نظام کالج حیدرآباد دکن

(۸)

مولانا روم کی غزلیات کی خصوصیات

محاسن ومعائب

چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم　　نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

(رومی)

ایران میں شاعری کا آغاز قصیدہ گوئی سے ہوا، اسکے قدردان "اہلِ دل" نہیں بلکہ اہلِ زر اور "صاحبِ امارت" تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدہ گوئی ذریعۂ معاش بن گئی، اس میں جوشِ دل، صداقتِ احساس اور جذبات کی ترجمانی کو بہت کم دخل تھا،

قصیدہ کا لازمی جزو تشبیب ہے، اور یہی غزل کی بنیاد ثابت ہوئی، ادھر توجہ ہوئی، تو بعض باکمال قصیدہ گو شعرا نے غزل سرائی کی، لیکن وہ عندلیبِ گلشن نہ ثابت ہوسکے، ان کے دلوں پر عشق کی چوٹ نہ تھی، ان کے جگر میں زخمِ محبت نہ تھا، انوری، خاقانی، اور ظہیر فاریابی وغیرہ کی غزلیات اثرِ دل آویزی اور گرمیِ جذبات سے خالی ہیں، زمانہ کا رنگ بدلا، مغلوں کے حملوں نے قصیدہ کے ان قدردان درباروں کا خاتمہ کردیا، قصیدہ گوئی کا بازار سرد ہوگیا، اور فطری شعرا جوشِ طبیعت کے تقاضے سے اپنے جذبات کی بے لوث ترجمانی کی طرف متوجہ ہوئے، تو اصنافِ سخن میں سے "غزل" "زبانِ حال" قرار پاگئی،

غزل کی خوش قسمتی ہے، کہ شیخ سعدی نے یہ نغمہ کچھ ایسی دلآویزی سے چھیڑا، کہ ہر زندہ دل اس
مسحور ہوگیا، خسرو اور حسن دہلوی نے تو اسے بوتا جادو بنادیا، لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہے، کہ جن اہل
دل اور اہلِ زبان بزرگوں نے فارسی نزل کو غزل بنایا، ان میں عارف رومی کا خاص مرتبہ ہے، اور
ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے، غزل کی معنوی بلندی بادۂ تصوف ہی کی منت پذیر ہے، مولنا نے غزل کو
نغمۂ حقیقت بنانے میں بڑا کام کیا ہے، بیشک غزل گوئی میں حسنِ ادا، پیرایۂ بیان، جدتِ اسلوب اور
رنگینیٔ کلام کے اعتبار سے مولینا سعدی، عراقی، خسرو، اور حسن دہلوی کے ہم پایہ نہیں، لیکن تخیل کی بلند
جوشِ بیان اور حقائق کی ترجمانی کے لحاظ سے ان کا مرتبہ زیادہ بلند ہے، اگر ان کے کلام کے صرف بہتر
حصہ پر نظر کی جائے، تو ان کی جگہ صفِ اول ہی میں ہوگی،

جذباتِ نگاری اور اصلیت

شعر کا اصلی سرمایہ احساسِ قلب اور جذبۂ باطن ہے، یہی جذباتِ نگاری اور
کلام کی اصلیت ہے،

گرمیٔ افکارِ ما از نارِ اوست — آفریدن، جاں دمیدن کارِ اوست

یہ نہ ہو تو اشعار منافق کی مدح سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، شیخ سعدی سے پہلے جن شعرا
نے غزلیں کہیں، تقریبًا ان کا کلام "زبانِ بے دل" ہے
وہ عشق کے زخم خوردہ نہیں ہیں، انکے سینوں کے اندر آتشِ الفت کا پتہ نہیں، صرف حسنِ سخن
کیلئے انھوں نے عشق کی ترجمانی شروع کی،
لیکن جب دردِ دل رکھنے والے شعرا نے غزل سرائی کی، تو وہ تاثیر اور سوزِ دل کا
سرمایہ بن گئی،

صوفی شعرا میں شدتِ اخلاص اور صداقتِ احساس کے باعث اس جذبہ کی گرمی اور
اس آگ کی تیزی ناقابلِ بیان ہوگئی، اسی لئے سعدی، خسرو، حسن، عراقی، اور حافظ کے کلام کا ...

"جذباتِ نگاری" ہے،
مولینا روم کا دل فطرۃً امینِ عشق واقع ہوا تھا، وہ فطری شاعر تھے، اگرچہ ایک مدت تک مولویانہ
مذہبیت اور وطن کے ماحول کے باعث شعر گوئی سے پرہیز کرتے رہے، لیکن جب شمس تبریز سے ملاقات
ہوئی، تو ایک ہی نظر میں مولینا نے عقل و ہوش کو خیرباد کہا، انکی حکمت اور نکتہ دانی "جنونِ عشق"
سے بدل گئی، آخر کار یہ حال ہوا، ع

"دلِ خود کام را از عشق خوں کرد"

آزمودم عقلِ دور اندیش را — بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را،

مولینا کی دل کی چھپی اور دبی ہوئی چنگاریاں کچھ ایسی بے پناہ آتشِ شوق کی صورت میں
بھڑک اٹھیں، کہ بجھائے نہ بجھتی تھیں، جذباتِ محبت نے طوفان کی صورت اختیار کی، مولینا نے
جان و دل کے تقاضے سے مجلسِ سماع آراستہ کی، اس میں دوسروں کی نظمیں کماحقہ ترجمانی حال
کا کام نہ دے سکتی تھیں، محفلِ سماع کے لئے مولینا خود غزل لکھنے لگے، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اصلیت
سے معمور ہے، اور سراپا جذباتِ دل کی سچی تصویر ہے، اسی لئے جذباتِ نگاری جو محاسنِ شاعری
کا جزوِ اعظم ہے، مولینا کے کلام کی اولین اور اہم ترین خصوصیت ہے، ان کے اشعار بہانہ جو کے آنسو
نہیں ہیں، بلکہ ان کا سینہ سوزِ باطن سے معمور ہے، ان کے دل پر عشق کے داغ ہیں، جو کچھ کہتے ہیں:
آپ بیتی ہے، ان کی غزل دل کی زبان ہے، ان کے کلام میں ذوقِ سخن نے گفتارِ محبت کا
پیرایہ اختیار کیا ہے،

صاحب مناقب العارفین نے جذباتِ نگاری کے متعلق مولینا کا ایک قول نقل کیا ہے،

"مجرائے سخن سہ گونہ است، یکم از نفس روان می شود، دویم از عقل، سیوم، از عشق،
ہمانا کہ سخن نفس مکدر است وبے مزہ کہ نہ گوئندہ را ذوق است ونہ شنوندہ را فائدہ،

دوم سخن عقل است وآن مقبول عقل است، وبنیوع فوائد کہ ہم شنوندہ را پر ذوق کند وہم گوینده را، سیوم سخن عشق است کہ ہم گوینده را مست کند وشنوندہ را سرخوش گرداند وبطرب آرد"

جذبات نگاری، مولنٰنا کا کلام سخن عشق ہے، اسلیے وہ دلی جذبات کا آئینہ ہے، ان کا کلام اور زندگی ہم آہنگ ہیں، وہ شعرا کی جماعت "یقولون مالایفعلون" سے علحدہ ہیں، اور اس خصوصیت میں مولنٰنا فارسی کے دیگر نامور صوفی غزل گو شعرا کے شریک ہیں،

سوزِ دل کے متعلق فرماتے ہیں :-

عشق شد مہمان ہر دل سوختہ   جان و دل از بہرِ او قربان کنم

ایک مست الست کی حیثیت سے اپنے انجام کا نقشہ کھینچتے ہیں،

بپیش پیرمے خانہ بمیرم   زہے مرگ وزہے برگ وسرانجام

مطلوب اور محبوب کیسا تھ وابستگی، اور وارفتگی کا بیان ہے،

ہر کہ بیند رخِ تو جانبِ گلشن نرود   ہر کہ داند لبِ تو قصۂ ساغر نہ کند

مولنٰنا بادۂ محبت سے مخمور ہیں،

مخمور توام بدست من دہ   آن جام شراب کوثرے را

عاشق میدانِ طلب میں، رفیقِ راہ کا طالب ہے،

طبیب درد بے درماں کدام ست   رفیق راہ بے پایاں کدام است

شبِ وصال کی لاجواب تصویر ایک ہی مصرعہ میں کھینچ دی ہے،

ع گل چیدن است امشب مے خوردن است امشب

اضطراب عشق اور انتظار کے جذبات کی کسقدر کامیاب ترجمانی ہے،

قرارے نہ دارد دل وجان ما   کنارے نہ دارد بیابان ما

عشق نے شاعر کے دل وجان میں گھر کر لیا ہے، اس حالت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے،

در دل وجاں خانہ کردی عاقبت   ہر دو را دیوانہ کردی عاقبت

دلِ عاشق ہر وقت حضورِ یار کا متمنی ہے،

یک لحظہ ز کوئی دوست دوری   در مذہبِ عاشقاں حرام است

عاشق بے تاب شب و روز کوچۂ یار میں چکر لگاتا ہے، لیکن اوس کی یہ آرزو ہے، کہ کسی دن دلدار بھی اسکی گلی میں آجائے، اور اس کوچۂ ویران کو اپنے قدم سے رشکِ بہشت بنا دے،

مخمور و مست گرداں امروز چشم مارا   رشک بہشت گرداں امروز کوے مارا

مولنٰنا پر مستی اور جذب طاری ہے، ایک دیوانگی کی سی حالت ہے، فرماتے ہیں،

اے عاشقاں اے عاشقاں امروز من دیوانہ ام   مست وخراب و بے خبر زاں جام وزاں پیمانہ ام

بادِ عشق سے درخواست فرماتے ہیں، کہ اس طرف سے بھی ہو گذرے،

اے بادِ خوش کہ برچمنِ عشق می وزی   برمن گذر کہ مژدۂ ریحانم آرزوست

عاشق شرابِ الفت سے مست و بے خود ہے، اسے سارا عالم مست نظر آتا ہے، اس خوبی سے اسکو بیان کیا ہے، کہ مستی کی ہمہ گیری کا منظر پیشِ نظر ہو جاتا ہے،

رعد مطرب، برق مشعل، ابر ساقی آمدہ   باغ مست وراغ مست وغنچہ مست وخار مست

باوجود اس مستی کے عاشق بے خودی کی تمنا ہے کہ

یکدست جام بادہ ویکدست زلفِ یار   رقص چنیں میانۂ میدانم آرزوست

آئینہ میں عکسِ یار دیکھ چکے ہیں، لیکن ذوقِ دیدار کا یہ عالم ہے کہ محبوب کا جمالِ جہان آرا بے پردہ دیکھنا چاہتے ہیں،

عکس در آئینہ اگرچہ نکوست،   لیک ہماں صورتِ زیبا خوش است

جب یہ آرزو خوش بختی سے پوری ہوتی ہے، تو ذوقِ عشق ایسا ہے کہ جان نذر کر دیتے ہیں،

دیدہ از خلق بہ ستم چو جمالش دیدم   منت بخشایش او گشتم و جاں بخشیدم

دیکھئے مسرتِ وصال کا اظہار کس انداز میں ہوتا ہے،

چو گل شگفتہ شوم در وصالِ گلرویم   رسد نسیمِ بہارم چہ خوش بود بخدا،

محبوب کے حسن و جمال کا مرتبہ بیان ہوتا ہے،

ز رویت ماہ اختر می تواں کرد،   ز زلفت مشک و عنبر می تواں کرد

یہ سب ایک سچے عاشق کے دلی جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہے، ان شعلوں کی علتِ غائی آتشِ عشق ہے جو کسی پانی سے نہیں بجھائی جا سکتی،

باز آمد آں مے کہ ندیدہ فلک بخواب   آورد آتشے کہ نمیرد بہیچ آب،

میر شراب خانہ چو شد بادلم حریف   خونم شراب گشت ز عشق و جگر کباب

حقایق کی ترجمانی

مولینا کے کلام کی اصلیت کا دوسرا پہلو حقایق کی ترجمانی ہے، مولینا نے اپنے کلام میں بے شمار انفسی اور آفاقی حقایق کی تعبیر اور تفسیر فرمائی ہے، جس سے افراد اور اقوام اپنی زندگی اور تخیل کی تعمیر اور باطنی تربیت میں نہایت گرانمایہ رہنمائی حاصل کر سکتی ہیں،

ایک حقیقت بین نظر کے لئے اس میں رمز شناسی اور راز دانی کا ایک غیر محدود ذخیرہ ہے، یہی بات مولینا کے کلام کی معنوی خصوصیت اور حقیقی قدر و قیمت ہے، شعر گوئی سے مولینا کا منشا بھی تھا کہ حقایق پیرایۂ شعر میں بیان ہو جائیں، سپہ سالار کا بیان ہے،

"حضرت خداوندگار قدس سرہ میخواست کہ حقایق ہمہ مشائخ و مقصود ہمہ عالمانرا در ہر حینے بیان فرماید، کما قال قدس اللہ سرہ"

خواہم کہ کفک خونیں از دیگ جاں بر آرم   گفتار دو جہان را از یک دہاں بر آرم

یہ شعر تو مولینا کا ہے، جس سے اس خصوصیت کے متعلق خود صاحبِ دیوان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے، یہ صفت پورے عروج و کمال پر مثنوی میں ملتی ہے، لیکن دیوان میں بھی نمایاں ہے، مثلاً "سترانا" کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں،

از کنارِ خویش یابم ہر زماں من بوے یار   چوں نگیریم ہر شبے مر خویش را اندر کنار

عشق اور بندگی کے متعلق اظہار خیال یوں ہوتا ہے،

دیگران آزاد سازند بندہ را   عشق بندہ می کند آزاد را،

ڈاکٹر اقبال کا ایک شعر ہے، جو اس مطلب و مفہوم کا حامل ہے، کہ عاشقانہ بندگی ہی میں ماسوا سے آزادی نصیب ہو سکتی ہے،:-

عقل گوید شاد شو آزاد شو،   عشق گوید بندہ شو آزاد شو،

(رموز بے خودی)

تخلق باخلاق الٰہیہ کا راز بیان کیا ہے،

درونِ دل سفرے کن اگر خدا طلبی   ز خوئی خود گذرے کن بجوئی خوے خدا

طلب و حصول کا ربط ظاہر کیا ہے،

روزی ز طلبگاری مطلوب بدست آید   گر زاں کہ ترا در دل عشق و طلبی باشد

شادی وصالِ جاں روزی رسد از جاناں   آنرا کہ درونِ دل از عشق غمی باشد

بے رنج دریں ویراں آں گنج مجو ایجاں   کاں گنج گراں مایہ بے رنج نمی باشد

ترک کبر اور عجز عبدیت کا کیا حاصل ہے، جواب ملتا ہے،

کبر و تکبر بگذار و بگیر،   در عوض کبر چنیں کبریا،

حقیقتِ تخلیق پر روشنی ڈالی ہے،

ہزار صورت بے چوں بامر کن موجود ــــ شد ست وہیشود اے دل دو دیدہ وا کُنّا

سلوک الی اللہ کا طریقہ بتایا ہے،

یک حملۂ مستانہ مردانہ بکردیم، ــــ تا علم بدادیم و بہ معلوم رسیدیم،

باآیت کرسی بسر عرش پریدیم، ــــ تا حی بدیدیم و بقیوم رسیدیم،

عاشق علم لدنی سے کس طرح فیضیاب ہوتا ہے؟

خمش کوتہ کن اے خاطر کہ علم اول و آخر ــــ بیان کردہ بود عاشق چو پیش شاہ لالا شد

غافل کو جگاتے ہیں،

چناں بنہ تو دو چشمت کہ ذرہ را بینی ــــ میان روز نہ بینی تو شمس کبریٰ را

مثنوی میں بھی حق سے غفلت کو موت سے تعبیر فرمایا ہے:۔

مرگ حاضر غائب از حق بودن است

غرض یہ کہ مولینا کا کلام حقایق کا ایک دریاے بے پایاں ہے،

جوش خیال اور بیان

بیا کہ من زخم پیر زدم آوردم

مے سخن کہ جواں تر ز بادہ عنبی است (اقبال)

مولینا کے خیالات میں جو ہنگامہ و جوش اور بیان میں جو زور اور وجد پایا جاتا ہے، اوس کی نظیر کسی اور غزل گو صوفی شاعر کے کلام میں نہیں، یہ صفت مولینا کی غزلیات میں خاص طور پر نمایاں ہے،

تخیل کی پرواز کا یہ عالم ہے کہ آن کی آن میں عالم معنی کی سیر برق رفتاری کیساتھ ہوتی ہے، قلب میں عشق کی گرمی اور جذبات کا طوفان برپا ہے، اس سے خیالات میں یہ جوش ہے، پھر زبان دل کی

ہم آہنگ ہے، جس شدت سے خیال پیدا ہوتا ہے، اسی شدت سے بیان کرتے ہیں، غزل بانگِ اسرافیل معلوم ہوتی ہو کہ محشر انگیزی پر آمادہ ہے، جوشِ تخیل اور بیان کے اعتبار سے مولینا کا کلام شعر کے اس معیار پر پورا پورا اترتا ہے،

نغمہ باید تند رو مانند سیل، ــــ تا برد از دل غمان را خیل خیل،

اصل بات یہ ہے کہ مقاماتِ تصوف کا تعلق قلب اور جذبات سے ہے، مولینا کا قلب اسی عالم کی سیر میں مصروف تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو تخیل کا زور معنی آفرینی میں کمال دکھاتا ہے، تو دوسری طرف بیان مواج سمندر کے مانند لہریں لے رہا ہے، اس سے کلام میں بے حد زور اور اثر پیدا ہو گیا ہے جو پڑھتا ہے اس طوفان انگیز سمندر کی موجوں کے ساتھ ہو کر بہنے لگتا ہے، جوش کا یہ عالم ہے کہ جس قوت سے وہ کسی خیال کو ادا کرتے ہیں، اسی قوت سے اسے قبول کرنا بھی آسان نہیں، یہ جوش کسی خاص خیال یا موقع سے مخصوص نہیں جس خیال کو ظاہر کرتے ہیں، تو ان کا طبعی جوش اس سے نمایاں ہوتا ہے مسرت وصال کا ذکر کریں تو دل مارے خوشی کے اچھلنے لگتا ہے، غم ہجراں کا بیان ہو تو احساس اضطراب تیز ہو جاتا ہے، بقا کا رنگ اس جوش اور زور سے دکھاتے ہیں، کہ آدمی اپنے آپ کو غیر فانی محسوس کرنے لگتا ہے، فنا کا عالم دکھانے میں یہ انداز ہے کہ عالم کی ایک ویران کدہ اور فانوس خیال کے ایک مجموعہ سے زیادہ حقیقت نہیں معلوم ہوتی، جوشِ خیال اور بیان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں جن سے یہ حقیقت آئینہ ہو جائے گی،

اے نوبہار عاشقاں داری خبر از یار ما ــــ ای ز تو آبستن چمن وے از تو خنداں باغہا

اگر افلاک نہ باشد بخدا باک نہ باشد ــــ دلِ غمناک نہ باشد چہ کنی گفت علالا

عاشق کو کس جوش سے مخاطب فرماتے ہیں:۔

چوں چشم بجوش از دل سنگ، ــــ بشکن تو سبوے جسم و جاں را،

مرد خدا کی ہمت وغیرت کا بیان ہے،

مرد خدا مست بود بے شراب — مرد خدا سیر بود بے کباب

مرد خدا بحر بود بیکران، — مرد خدا قطرہ بود بے سحاب

اے چنگ پردہ ہائے سپاہانم آرزوست — وے نائے نالۂ خوش وسوزانم آرزوست

این ہمرہان سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا ورستم دستانم آرزوست

آخری شعر سے مولنا کے رنگِ طبیعت اور جوشِ خیال کا خاص اندازہ ہوتا ہے،

جوشِ عزم ملاحظہ ہو،

ہر نفس آوازِ عشق میرسد از چپ وراست — ما بفلک می رویم عزم تماشا کراست

جوشِ عشق کی تصویر کھینچتے ہین،

گفتم کہ چند خوانی گفتا کہ تا نخوانی — گفتا کہ چند جوش گفتم کہ تا قیامت

مولنا کی ہمت عالی اور قوت تسخیر پر نظر کیجئے،

ہمت عالیت در سرہائے ما، — از ثرے تا عرش اعلی می رویم

وان اژدہا را بر دریدم، — جہانِ عیش را آباد کردم،

عہد حاضر کے فارسی شعرا میں ڈاکٹر اقبال اس خصوصیت اور مناسبت میں اس پرجوش عارف رومی کے ہمرنگ ہین، اون کے تخیل میں بھی زور اور بیان میں بھی جوش ہے، خود ان ہی کا بیان ہے،

مطرب غزلے بیتے از مرشدِ روم آور — تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزی

مثالاً کلام ملاحظہ ہو،

تا کجا در تہ بالِ دگران می باشی — در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

بشاخ زندگی مانمی ز تشنہ لبی است — تلاشِ چشمۂ حیوان دلیلِ کم طلبی است

خاص مضامین، ہر شاعر اپنی طبیعت اور بلندی مزاج کے مطابق خاص خاص خیالات اور مضامین کا دلدادہ ہوتا ہے، یہ مضامین اس کے خصوصیات میں گنے جاتے ہیں، اور مہماتِ مضامین کہلاتے ہیں، مولنا میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، اور کلام کی معنوی خصوصیات میں بیحد نمایاں ہے، وہ چند احساسات اور خیالات کے خاص طور پر دلدادہ ہین، ان کے کلام میں ایسے مضامین مختلف پیرایہ اور اسلوب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، مثلاً عشق کی اہمیت اس کے نتائج انسان کی عظمت اور عروجِ انسانی کی راہ عقل وعشق کا مقابلہ دل کی تربیت اور اس کے طریقے وغیرہ یہ چند خاص خیالات ہیں، جن کو مولنا نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں طرح بیان کیا ہے، ہم ایک تسلسل سے ان جملہ مضامین کو بیان کرین گے تاکہ خصوصیاتِ کلام واضح ہو جائین،

از صدائے سخنِ عشق ندیدم خوشتر

یادگاری کہ درین گنبدِ دوار بماند (حافظ)

عشق اور اسکے تعلقات، مولنا نے عشق، اسکے متعلقات اور اسکے مختلف پہلوؤں پر اس کثرت سے اشعار لکھے ہیں، کہ اگر ان کے دیوان کو "ترانۂ عشق" سے تعبیر کریں تو بیجا نہ ہوگا، ان کی یہ خصوصیت مثنوی مین بھی بیحد نمایاں ہے، سچ یہ ہے کہ عشق زندگی کی بنیادی حقیقت ہے، اس کا ترانہ زندگی کا سب سے عظیم الشان نغمہ ہے، عشق ہی سے قربانی پیدا ہوتی ہے، عشق کے محل مختلف ہوسکتے ہین، کوئی کسی کے حسنِ عارض کا شیدا ہوتا ہے، ورڈزورتھ کا سا مزاج رکھنے والا شاعر رنگین وادی پر اپنی جان فریفتہ کرتا ہے، کوئی کسی کی تصویر کا عاشق ہوتا ہے، لیکن کسی کا قلب اسقدر وسیع اور نظر اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہ اپنی نگاہ محبت کے لئے "حسن ازل" کو تاکتا ہے، کیونکہ عشق کی شان اس کے مقصد کی وسعت و بلندی سے ہے، کامل طور پر وہ عشق کا لذت آشنا ہے، اسلئے اپنے عشق کو ابدیت بخشنا چاہتا ہے، اور یہ ممکن نہیں جبتک اس کا محبوب ابدی نہ ہو،

عشق زندہ در روان و در بصر، ہر دمی باشد ز غنچہ تازہ تر،

عشق آں زندہ گزیں کو باقیست از شراب جانفزایت ساقیست

(مثنوی معنوی)

عشق اور مذہب میں ربط کا یہی محل ہے، جب تک مذہب صحیح معنون میں ہوتا ہی، یہ اتحاد قائم رہتا ہی جب ذوقِ صحیح فنا ہو جاتا ہے، توان دونوں میں افتراق ہو جاتا ہی

در غلامی عشق و مذہب را فراق انگبینِ زندگانی بد مذاق،

مولینا اسی حلقہ عشاق میں داخل ہیں، اسلئے انھوں نے عشق پر بے حد زور دیا ہے، اس کی وکالت کا حق ادا کیا ہے، ان کے نزدیک عشق سے مراد "عشق خدائے احسن" ہے،

ہر چہ جز عشق خدائے احسن است گر شکر خوردن بود جاں کندن است

انھوں نے عشق کی اہمیت، اثرات اور نتائج کو اسی روشنی میں بیان کیا ہے، عشق کی اہمیت کے متعلق لکھتے ہیں،

عشق معراج است سوئے بام سلطان ازل از رخِ عاشق فرو خواں قصۂ معراج را

عشق ابدی زندگی ہے،

عشق است و عاشق است کہ باقیست تا ابد دل بر جز منہ کہ بجز مستعار نیست،

عشق جز دولت و ہدایت نیست جز کشادِ دل و عنایت نیست،

عشق ہی خوش نصیبی ہے،

گر ترا بخت یار خواہد بود عشق را با تو کار خواہد بود

عمر بے عشق لاحاصل ہے،

عمر کہ بے عشق رفت ہیچ حیاتش مگیر آب حیاتست عشق در دل و جانش پذیر

دگر بیکار گردد چرخ گردون، جہانِ عاشقاں بر کار باشد

ہر کہ در و نیست ازیں عشق رنگ نزد خدا نیست بجز چوب و سنگ

عشق کے بغیر دولت و جاہ سب ہیچ ہے، اور عشق سے مولینا کی اصل مراد کیا ہے،

منصب و ملک از دل بے عشق راست جز کفن اطلس و جز گور نیست،

آن روح را کہ عشق حقیقی شعار نیست نابودہ بہ کہ بودن او غیر عار نیست

عشق ہی قلب کو مطمئن رکھتا ہے،

ہر کہ زعشاق گریزان شود، عاقبت الامر پریشاں شود،

خانہ عشق کی بڑی فضیلت ہے،

فی الجملہ ہر آنکس کہ دریں خانہ رہے یافت سلطانِ جہان است و سلیمان زمانست

بنی آدم کی بزرگی عشق ہی کے تاجِ کرامت سے ہی،

کہ عشق خلوت جانست طوق کرمنا برائے ملک وصال و برائے رفع حجاب

عشق کے نتائج کیا ہوں گے، مولینا نے کئی اشعار میں مختلف طریقہ سے اس کا جواب دیا ہی،

غمزۂ عشقت بدان آرد یکے محتاج را کو بیک کہ بر نسنجد ہیچ صاحب تاج را

گلزار کند عشقت آن شورۂ خاکی را در بار کند موجت این چشم سحابے را

کیمیائے کیمیا ساز است عشق، خاک را گنجِ معانی می کند

عاشق کا دل عرش سے فزوں تر ہے،

بر ہر چہ ہمی ارزی میدان کہ ہمی ارزی زیں روے و دل عاشق از عرش فزوں باشد

عشق کی ترقی و تکمیل استقامت میں ہے،

ہم بذوق این درد را درمان کنم ہم بصیر این قصہ را پایان کنم،

(باقی)

تبصرہ و نقد

شکایت

"معارف مئی ۱۹۳۶ء میں تاریخ الحدیث پر جو اظہارِ خیال کیا گیا تھا، اسکو پڑھکر مصنف کو بجا طور سے ناخوشی ہوئی، اونھون نے اس ناخوشی کا اظہار ذیل کی تحریر میں کیا ہے، اس تحریر کا کوئی جواب شائع نہیں کیا جاتا، اور نہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کا اصل مصنف کون ہے، قاضی ظہور الحسن صاحب یا قاضی عبد الصمد صاحب، تاکہ الفاظ کی مزید گرمی طرفین کی سرد مہری کا سبب نہ ہو، رفقائے دار المصنفین کی تصانیف کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسکا جواب "زبانِ خلق" دیگی، "معارف"

معارف مئی ۳۶ء میں تاریخ الحدیث پر جو تبصرہ کیا گیا ہے، اس میں یہ سعی کی گئی ہے، کہ کتاب مذکور از اول تا آخر دوسروں کی تالیفات سے ماخوذ ہے،

مصنف کی دیانت اسی سے ثابت ہے کہ اس نے اردو میں تاریخ حدیث کے متعلق جسقدر کتابیں مطالعہ کیں، ان کا بہ تفصیل دیباچہ میں ذکر کر دیا، ان کتب میں سیرۃ النبی وخطباتِ مدراس، یہ دو کتابیں دار المصنفین کی ہین، دو مضمونون میں معارف سے مدد لی گئی ہے، ان سب کا حوالہ موقع بموقع موجود ہے، لیکن تبصرہ نگار نے اپنی طرف سے لکھدیا کہ اسوۂ صحابہ وغیرہ سے بھی مدد لی گئی ہے، صاحب موصوف کے اس علم کا ذریعہ سوائے الہام کے اور کیا ہو سکتا ہے، اگر مصنف نے اسوۂ صحابہ سے مدد لی ہوتی، تو مثل دیگر کتب کے اسکے تذکرہ سے کون امر مانع تھا، ایک دلیل انھوں نے اس کتاب سے اخذ کرنے کے متعلق یہ قائم کی ہے، کہ بعض سرخیاں ان کی کتابون سے ملتی ہین، یہ درست ہوگا، لیکن یہ سرخیاں اور فقرات وہ ہیں، جو یہ فقیر اسوقت اپنی تصانیف میں لکھ چکا ہے، جب کہ دار المصنفین کے وجود کا کہیں وہم وگمان بھی نہ تھا، خاکسار کے اسلاف میں اکثر بزرگ علم اور حدیث کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں، ان کی یادداشتوں کا کثیر ذخیرہ موجود ہے، ۱۸۹۵ء سے اس فقیر نے علمِ حدیث و فقہ اور حالاتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم و بزرگانِ دین میں مضامین وکتب تصنیف کرنی شروع کین، ہندوستان کے تمام کتب خانوں کو چھان ڈالا، ہندوستان سے باہر بھی کسی قدر کتب بینی کی، تو کیا اسقدر جد وجہد کے بعد بھی یہ سرخیاں اور یہ فقرات لکھنے پر قدرت نہیں ہو سکتی، یا وہ کتابیں جنسے تصنیفاتِ دار المصنفین مرتب کی گئی ہیں، ممبرانِ دار المصنفین کے سوا کسی دوسرے کو میسر نہیں، یا کوئی ان کو پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتا، یا ممبرانِ دار المصنفین کا تعلق براہ راست حدیث جبریل سے ہے، اسلئے ان کے فقرات والفاظ سے توارد بھی ممکن نہیں،

سیرۃ النبی و دیگر تصانیف دار المصنفین میں اس فقیر کے مضامین سابقہ اور علامہ کی تصانیف اور مسٹر سراج الدین کی کتاب الفاروق اور مسٹر محمد علی قادیانی کی تالیفات اور سرسید کی تصانیف کے مسلسل فقرات آئے ہین، تو کیا ممبرانِ دار المصنفین نے یہ فقرات ان مصنفین کے سرقہ کئے ہیں یا خود لکھے ہین،

اور اگر درحقیقت ایسا ہی ہے، جیسا کہ تبصرہ نگار صاحب کا خیال ہے، تب بھی ایک صاحب ظرف اور عالم کے قلم سے ایسا تبصرہ نکلنا قابلِ افسوس ہے،

تمام اسلامی عقائد ومسائل وتاریخی واقعات کے متعلق عربی میں کافی سے زیادہ ذخیرہ موجود ہے، سب وہیں سے اخذ کرتے ہیں، اور جو جس مسئلہ پر کوئی تصنیف کرتا ہے، وہ مختلف کتب سے مواد فراہم کرکے جمع کرتا ہے، الہام کسی کو نہیں ہوتا، پس اس فقیر کو بھی تاریخ حدیث کے متعلق یہی شرفِ حاصل ہے، کہ سب سے پہلے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو کر مسلمان بھائیوں کی خدمت میں پیش کیا ہے، اور اس شرفِ اولیت کو جناب مولینا سید سلیمان صاحب و دیگر مقتدر علماء نے تسلیم فرمایا ہے، اور تبصرہ نگار صاحب نے بھی دبی زبان سے اسکا اقرار کیا ہے،

راقم:- قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی،

معارف:- ہمارے ذاتی افادہ کے لئے اس قسم کی چند مثالیں بھیجکر ممنون فرمائیے،

تصحیح

مقالہ "عربون کی جہازرانی پر استدراک"

"عربوں کی جہازرانی پر استدراک" کے عنوان سے معارف کے دو نمبرون (مئی وجون ۳۶ء) مین جو مقالہ شائع ہوا ہے وہ افسوس ہو کہ راقم سطور کی عدم موجودگی میں مصحح معارف اور بعض کارکنوں کی مسامحت سے ایک سے زیادہ مقام پر غلط چھپ گیا ہے، فاضل مقالہ نگار نے ان غلطیوں کی تصحیح بھیجی ہے، جو ذیل میں شکریہ کیساتھ درج کی جاتی ہے،

سب اڈیٹر"،

صفحہ ۴۲۰ سطر ۱۱ و ما بعد بجائے مطبوعہ عبارت کے یوں پڑھئے "مرکوس اپنے ہلکے پن کے باعث پانی لیجانے کیلئے مناسب ہے، اور اس میں ایک سوار دبے کچھ کم پانی سما سکتا ہے"،

ص ۴۲۵ سطر ۱۰، صحیح یوں ہے: "بو عظی گوش ایدن عربا ندن اللی بیگ آدم"،

ص ۴۰۶ سطر ۹ یوں پڑھئے :- "اور ہجر کے اسباب کی خریداری کرتے ہیں"،

" سطر ۱۳، ۱۵، صحیح یون ہے، "جو بحرین میں ہے، بازار جمادی الآخرہ کے پہلے دن سے مہینے کے آخر دن تک لگا رہتا ہے اور ایرانی لوگ اپنا سامان تجارت لے کر ....."

ص ۴۰۷ سطر ۱۱، ۱۲ میں یوں اصلاح ہو :- "اور عطر خلق کو اہل عرب کے سوا کوئی دوسرا عمدہ نہیں بنا سکتا"

ص ۴۰۹ حاشیے کی سطر دوم یون پڑھئے :- "جس کا بعد میں ایک ناقص ترجمہ ترکی زبان میں بھی ہوا"

ص ۴۱۱ سطر ۹ و ۱۲ کی غلطیاں سخت ہیں، یہ عبارت اصل میں یوں ہے :- "انکو چھوڑ دو گے تو تم پر ہمیشہ مسلط رہیں گے، ـــ اور انبار کی بھی مدد نہیں کی، بلکہ غیر جانبدار رہے"،

عربُوں کی جہازرانی

یعنی مسلمانون کے فن جہازرانی کی ترقیوں جہازرانی کے کارخانوں اور اسلامی بندرگاہوں کی مکمل تاریخ ۱۹۹ صفحے قیمت عہ

تلخیص و تبصرہ

یورپ کیلئے ایک جدید سیاسی فلسفہ کی ضرورت

معارف بابتہ ماہ جون ۳۶ء میں "عقل کے خلاف جدید بغاوت" کے عنوان سے رینے فولپ ملر کے جس مضمون کی تلخیص پیش کی گئی تھی، اس پر پروفیسر موواٹ (R.B. MOWAT) کا ایک مقالہ اپریل ۳۶ء کے ہبرٹ جرنل میں شائع ہوا ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے، پروفیسر موصوف بین الاقوامیت کی کامیابی سے متعلق جو امید قائم کر رہے ہیں، اسکی حقیقت امید موہوم سے زیادہ نہیں، اٹلی اور حبش کے معاملہ میں انجمن اقوام کی طرف سے جس خود غرضانہ بے بسی کا مظاہرہ کیا گیا، وہ جدید قومیت کی ہمہ گیری کی ایک واضح اور قطعی دلیل ہے :-

ہبرٹ جرنل کے جنوری نمبر میں رینے فولپ ملر (RENE FULOPMILLER) نے دکھایا تھا کہ انیسویں صدی کی ذہنیت جب لوگ عقل پر عقیدہ رکھتے تھے موجودہ دور کی ذہنیت سے جب دیدہ و دانستہ عقل کی مخالفت کی جا رہی ہے، حیرت انگیز طور پر مختلف تھی، "عقل سے بغاوت" ایک حقیقی امر ہے، تاہم ہو سکتا ہے، کہ موجودہ صورت حال تمامتر عقل کی مخالفت کے باعث نہ ہو، بلکہ ایک قدیم نظام کے دفعتہً درہم برہم ہو جانے اور ایک جدید نظام کی فطری تلاش وجستجو کے سبب سے پیدا ہو گئی ہو، ۱۹۱۹ء کی صلح کے بعد کے پندرہ سال یورپ کی تمام قوموں کے لئے شدید مایوسی کے سال ثابت ہوئے، تقریباً وہ تمام امیدیں جن کے بھروسہ پر لوگوں نے جنگ کی مصیبتوں اور قربانیوں کو برداشت

کیا تھا، باطل ہوگئیں، سمجھا جاتا تھا کہ تشدد کی جگہ انصاف قائم ہوگا، کمزور قومیں دنیا میں سلامتی کے ساتھ رہ سکیں گی، منظم آزادی کی نعمت ہر جگہ پھیل جائیگی، تمام آدمیوں کے لئے کام، فرصت، اور معاش کا معقول انتظام ہوجائے گا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاسی شورشوں اور کشیدگیوں کا خاتمہ ہوکر ایک طویل مدت کے لئے امن وسکون قائم ہوجائے گا

لیکن ان پندرہ سالوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری مایوسی کا بنیادی سبب یہ ہے، کہ یورپین قوموں اور سنہ ۱۹۱۹ء کے اکثر مدبروں نے آنے والے دور کا غلط اندازہ کیا اور پندرہ برس سے برابر غلط اندازہ کرتے آرہے ہیں، وہ تغیر اور تبدیلی کے دور کو استقلال کا دور سمجھتے رہے، قومیں جو سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد کے زمانہ سے استقلال کی توقع رکھتی تھیں، محض حرکت اور تبدیلی سے دوچار ہوئیں، اور ان کی ساری امیدیں حیرانی اور مایوسی سے بدل گئیں،

سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے یورپ سیاسی حیثیت سے ایک صاف ستھرا اور مرتب مقام تھا، اس کا ایک سیاسی نظام تھا جو بحالت مجموعی ہمواری کیساتھ جاری تھا، یہ نظام چھ بڑی طاقتوں کے غلبہ پر منحصر تھا جو متحدہ طور پر یورپ کے لئے ایک قسم کی مجلس نظامت کی حیثیت رکھتی تھیں، یہ بڑی طاقتیں، برطانیہ عظمیٰ، فرانس، جرمنی، اٹلی، اسٹریا ہنگری، روس۔ یورپ کے ملکی نظام سے کافی طور پر مطمئن تھیں، یہ صحیح ہے کہ سرحدوں کا تعین بہمہ وجوہ بہترین نہ تھا، لیکن عملاً ملکوں کی ضرورتوں کے لئے وہ سرحدیں مناسب ثابت ہوئی تھیں، چھوٹی حکومتیں ملکی توسیعات کے حوصلے دل سے نکال چکی تھیں، اور اب صرف صلح وامن کی خواہاں تھیں، علاوہ بریں سنہ ۱۹۱۴ء سے قبل کے دور میں تمام بڑی اور چھوٹی حکومتوں میں معاشی تعلقات کا ایک نظام قائم تھا، انھیں ایک دوسرے کیساتھ تجارت کرنے میں اصولاً کوئی اعتراض نہ تھا، تجارت نسبۃً آزاد تھی، اس سے سیاسی اور معاشی آویزشیں بہت کچھ دور ہوگئی تھیں،

لیکن سنہ ۱۹۱۸ء کے بعد یورپ کی سیاسی حالت بالکل بدل گئی، اول یہ کہ جنگ عظیم سے قبل کی چھ بڑی طاقتیں باقی نہیں رہیں، آسٹریا ہنگری کی سلطنت جاتی رہی اور روس کا شمار جب تک سنہ ۱۹۳۴ء میں اس نے انجمن اقوام میں شرکت نہیں کی، دول عظمیٰ میں نہیں ہوتا تھا، صرف آسٹریا ہنگری کی سلطنت کے غائب ہوجانے سے یورپ کا اندرونی توازن برباد ہوگیا، اور بالخصوص وسط یورپ کی سیاسی حالت خطرناک طور پر ناقابل اطمینان ہوگئی، دوسرے یہ کہ نہ صرف چھ بڑی طاقتیں باقی نہیں رہیں بلکہ جو رہ بھی گئیں ان کی بھی کوئی متحد حیثیت جیسی سنہ ۱۹۱۴ء سے قبل تھی قائم نہیں رہی، ان طاقتوں کا قدیم متحدہ نظام جو انیسویں صدی اور پھر بیسویں صدی کے اول تیرہ سالوں تک قائم تھا جنگ عظیم سے درہم برہم ہوگیا اور سنہ ۱۹۱۸ء کے بعد پھر زندہ نہ ہوسکا، تیسرے یہ کہ چھ نئی حکومتیں وجود میں آگئیں، فنلینڈ، استھونیا، لتویا، لتھوانیا، پولینڈ، اور زیکوسلواکیا، ان میں سے کوئی بڑی طاقت نہیں ہے اور نہ کوئی آسٹریا ہنگری کی سلطنت کی قائم مقام ہوسکتی ہے، لیکن ان حکومتوں کے قائم ہوجانے سے سیاسیات یورپ میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے، جس نے یورپ کے اندرونی توازن پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہے، چوتھے یہ کہ نئی حکومتوں کے معرض وجود میں آنے اور رومانیا اور یوگوسلاویا کے رقبوں میں توسیع ہوجانے کی وجہ سے یورپ کی اندرونی سرحدوں میں چودہ ہزار میل کا اضافہ ہوگیا ہے، سرحدوں کے اضافہ کے ساتھ ہی ساتھ قومیت، تامین تجارت (PROTECTIONISM) اور درآمد کی مخالفت کے جذبات حیرت انگیز طور پر بڑھ گئے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اکثر حکومتوں کی حالت اقتصادی حیثیت سے خراب ہوتی جارہی ہے اور ایک دوسرے کے درمیان جو کشیدگی بڑھ رہی ہے وہ سیاسی نقطۂ نظر سے حد درجہ خطرناک ہے،

حالات کی مذکورۂ بالا تبدیلی کے باوجود "جدید یورپ" سے اطمینان اور استقلال کی توقع کا نتیجہ مایوسی اور حیرانی کے سوا کیا ہوسکتا تھا، تاہم اس عالمگیر اور دردناک حیرانی کا اصلی سبب کچھ اور ہی ہے،

اس وقت یورپ ایک ایسے دور میں ہے جب ایک قدیم عقیدہ فنا ہو رہا ہے، اور ایک جدید عقیدہ اس کی جگہ پیدا ہو رہا ہے، جو عقیدہ فنا ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ جمہوریت تمام مہذب قوموں کے لئے قدرتی اور بہترین طرز حکومت ہے، اور حکومتیں لابدی طور پر اس کی جانب بڑھتی جا رہی ہیں، اسی سیاسی عقیدہ کی تعلیم انیسویں صدی میں یورپ میں جاری تھی، غیر جمہوری حکومتوں میں بھی مثلاً جرمنی اور روس، اکثر لوگوں حتی کہ جمہوریت کے مخالفین کا بھی عقیدہ تھا کہ جمہوری حکومت ان کے ملکوں میں بھی بالآخر قائم ہو کر رہے گی، واقعات نے اس عام عقیدہ کی تصدیق کی اور یکے بعد دیگرے مختلف مملکتوں میں جمہوری حکومت قائم ہوتی گئی، جن مملکتوں نے مقاومت بھی کی انھوں نے بھی ایسی مراعات منظور کریں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مکمل جمہوریت کے لئے صرف وقت کا انتظار ہے، انیسویں صدی کی توہول کا فلسفۂ سیاست لوک (LOCKE) برک (BURKE) والٹیر (VOLTAIRE) اور روسو (ROUSSEAU) کی تعلیمات پر مبنی تھا، اٹھارہویں صدی یعنی "عہد عقل" کے ان مفکرین نے ثابت کر دکھایا تا کہ مہذب انسان کے لئے حکومت کی واحد معقول شکل جمہوریت ہے، اور تقریباً بلا استثنا، تمام فلاسفہ، فضلاء، معلمین اور اہل نظم نے ان کے خیالات کو تسلیم کر لیا تھا، لوک، برک، والٹیر اور روسو کے سیاسی خیالات یوروپین قوموں کے دل و دماغ میں سرایت کر گئے اور ہر سیاسی تحریک مثلاً جمہوریہ فرانس کا قیام، مملکت بلجیم کی تاسیس، اٹلی کا اتحاد، جرمنی کا اتحاد، اور وہ تمام جنگیں جو اس صدی میں پیش آئیں، یہ سب عالمگیر جمہوریت کی ارتقائی منزلیں قرار دی گئیں، اس سے سنہ ۱۹۱۴ء سے پہلے کی قوموں کا مطمح نظر سمجھ میں آتا ہے، وہ نہ صرف ایک سیاسی عقیدہ رکھتی تھیں، بلکہ سیاسی دنیا کا ہر واقعہ اس عقیدہ کو زیادہ مضبوط کرتا جاتا تھا، تمام واقعات اس ارتقائی نظام میں اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھتے جاتے تھے، دنیا تمام اہل نظر کے لئے قابل فہم اور معقول تھی،

لیکن سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد سے دنیا یا کم از کم یورپ اس عقلی اصول کو کھو چکا ہے، جمہوریت کی ناگزیری اب تسلیم نہیں کی جا سکتی، بعض تہذیب یافتہ مملکتوں نے جمہوریت کو آزمایا اور پھر اسے ترک کر دیا، بعض حکومتیں اور

بہت سے لوگ اس کے مخالف ہیں، پچھلے پندرہ سالوں میں جمہوریت میں بہت نمایاں طور پر زوال واقع ہو گیا ہے، اٹلی نے اسے ترک کر دیا ہے، روس نے اپنے سیاسی عمل کو الٹ دیا ہے، جرمنی نے جمہوریت کا تجربہ کیا، لیکن بارہ سال کے بعد اس سے دست کش ہو گیا، فرانس میں بھی جمہوری نظام کی مضبوطی اب باقی نہیں رہی اور اس کا قائم رہنا یقینی نہیں آج یورپ کی سیاسیات میں کوئی باقاعدہ اور مرتب نظام دکھائی نہیں دیتا اور کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کدھر جا رہا ہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رخ عام بدنظمی کی طرف ہے،

قدیم جمہوری عقیدہ کی ناکامی کے بعد اہل یورپ اب کسی جدید عقیدہ کے متلاشی ہیں، اس وقت دنیا میں دو جدید اور متقابل عقیدوں کی تشکیل ہو رہی ہے، قومیت اور بین الاقوامیت، قومیت کا عقیدہ انیسویں صدی کے جذبۂ قومی کی بظاہر ایک ترقی یافتہ شکل ہے، ورنہ حقیقۃً یہ ایک دوسری ہی چیز ہے، انیسویں صدی میں جب محکوم قومیں آزادی کے لئے جد و جہد کر رہی تھیں، تحریک قومیت کا مقصد قومی حقوق کو تسلیم کرانا تھا، لیکن اپنے قومی حقوق کے تسلیم کرانے کے معنی یہ نہ تھے کہ دوسری قوموں کے حقوق سے اعراض کیا جائے، برخلاف اس کے قومیت کی جو تشریح مزینی (MAZZINI) نے کی تھی اور جس سے تقریباً سب نے اتفاق کیا، اس کے رو سے قومیت کا عقیدہ حقیقۃً تمام قوموں کی عالمگیر برادری کا اصل اصول تھا،

جدید قومیت ایک دوسری ہی شے ہے، یہ آمادۂ پیکار رہتی ہے، غیر ملکی جابروں کے خلاف نہیں کیونکہ اب اکثر قومیں آزاد ہو چکی ہیں بلکہ ہمسایہ قوموں کے خلاف، اس کی بنیاد اقوام کی اخوت پر نہیں بلکہ اقوام کی خود غرضی پر ہے، توسیع مملکت کی "ضرورت" کو پورا کرنا خواہ دوسری قوم کو اس سے نقصان پہنچے اس کے حقوق میں داخل ہے، چنانچہ موجودہ ابتری کا سبب یہی قومیت ہے، اور اگر یہ قومیت سے اختیار کر لیجائے تو اس ابتری کا مستقل ہو جانا لازمی ہے،

دوسری تحریک بین الاقوامیت کی ہے، یہ جدید قومیت کی تحریک کی تمامتر مخالف نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد جدید قومیت کی برائیوں کو دور کرنا اور اس سے سبقت لیجانا ہے، بین الاقوامیت کے دو بنیادی اصول ہیں، ایک یہ کہ کسی قوم یا مملکت کا طرز حکومت، اندرونی سیاست اور داخلی حالات ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق تمامتر اس کے خانگی معاملات سے ہے، کسی غیر ملکی طاقت کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسری مملکت کے اندرونی معاملات میں دخل دے، جب تک کوئی ایسا معاہدہ موجود نہ ہو جس کے روسے مداخلت کا حق قائم ہوتا ہو، مثلاً اگر کسی مملکت نے اپنی حدود کے اندر غلامی کے انسداد سے متعلق دوسری مملکتوں سے معاہدہ کرلیا ہے، تو ان مملکتوں کو جہاں تک غلامی کے مسئلہ کا تعلق ہے مداخلت کا حق حاصل ہو جائے گا، دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر مملکت کی غرض دوسری مملکت کی آزادی اور استقلال میں شامل ہے، کیونکہ اگر کسی مملکت کی آزادی اور استقلال کے حق سے انکار کر دیا جائے تو اصولاً دوسری مملکتوں کے یہ حقوق بھی باطل ہو جائیں گے، بین الاقوامی قانون بڑی اور چھوٹی مملکتوں کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا، اس کے نزدیک تمام مملکتیں برابر ہیں،

موجودہ ابتری، تشویش، پریشانی، اور بحرانی کیفیت جو بار بار طاری ہوتی رہتی ہے یہ سب انہی دونوں عقیدوں کے تصادم کا نتیجہ ہیں، انجمن اقوام کا عہد نامہ جس پر ۲۰-۱۹۱۹ء میں چھبیس ۲۶ حکومتوں نے دستخط کئے تھے (اور جس کے شرکا کی تعداد اب تقریباً ساٹھ تک پہنچ گئی ہے) اس امر کا عام اور قانونی اعلان تھا کہ بین الاقوامیت کا عقیدہ عمومیت کے ساتھ تسلیم کر لیا گیا ہے، کچھ دنوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ساری دنیا بین الاقوامی ہوئی جاتی ہے، ہر حکومت اور ہر قوم نے حتی کہ انھوں نے بھی جو انجمن اقوام میں شامل نہ تھے (باستثنا سویٹ روس) بین الاقوامیت کے مذکورۂ بالا اصولوں سے متفق ہونے کا اعلان کیا، جدید قومیت کبھی کبھی حکومت کے کسی فعل کی محرک ہوئی ہو، لیکن کسی حکومت یا مدبر کی طرف سے علانیہ طور پر نہیں کہا گیا کہ ایسا ہونا بھی چاہئے،

برخلاف اس کے وہ بین الاقوامی تحریک کی حمایت کا اعلان متواتر معاہدوں کے ذریعہ کرتے رہے، جن میں سب سے زیادہ مشہور پیرس کا معاہدہ بریاند کیلاگ (BYIAND-KELLOGG PACT) ہے جو انسداد جنگ کے لئے ۱۹۲۸ء میں مرتب ہوا تھا، معاہدۂ پیرس میں سب نے شرکت کی، لیکن اس سے قبل ہی جدید قومیت کی تحریک بین الاقوامیت کی تحریک کے مقابل آچکی تھی، اس معرکہ میں پہلا قدم مسولینی نے اٹھایا جب کہ ۱۹۲۳ء میں اٹلی اور یونان کے ایک قضیہ کو اپنی خواہش کے مطابق طے کرنے کی غرض سے اس نے کورفو (CORFU) پر گولہ باری کردی اور اس مسئلہ کو انجمن اقوام کے سامنے پیش نہیں کیا، اسی قسم کی متعدد مثالیں جن میں سے بعض کامیاب اور بعض ناکام ثابت ہوئیں، پیش کیجا سکتی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتوں نے باہمی جھگڑوں میں بین الاقوامی فیصلہ پر قومی فیصلہ کو ترجیح دیا، وقتاً فوقتاً بین الاقوامی تحریک کی قوت اور ترقی بھی ظاہر ہوتی رہی، مثلاً ۱۹۳۲ء میں جب تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس منعقد ہوئی اور پھر ۱۹۳۳ء میں جب دنیا کے معاشی مسائل کے حل کیلئے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا اجلاس ہوا، لیکن یہ کانفرنسیں بالآخر ناکام ثابت ہوئیں، جدید قومیت کا زور بڑھتا ہی گیا، اٹلی اور حبش کی نزاع ان دو تحریکوں کے تصادم کی نہایت واضح اور بین مثال ہے،

مذکورۂ بالا تصریحات کی بنا پر ۱۹۱۹ء کے بعد کے دور کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہجاتی، اس دور میں دو مقابل تحریکوں اور عقیدوں یعنی جدید قومیت اور بین الاقوامیت کا مدوجزر صاف طور پر نظر آتا ہے، یورپین پبلک کی حیرانی اور مایوسی کا سبب یہ ہے کہ اس نے اس چیز کو سمجھا نہیں، اس نے یہ تو دیکھ لیا ہے کہ جمہوریت کی لابدی ترقی کا عقیدہ فنا ہو رہا ہے، لیکن ابھی تک یہ نہیں دیکھا ہے کہ دو جدید عقیدے پیدا ہو کر میدانِ عمل میں بڑھ رہے ہیں، اس نے ۱۹۱۹ء میں آنے والے دور کا غلط اندازہ کیا اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، یہ غلطی واضح ہوتی گئی، اور حیرانی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، جس وقت لوگوں کو متعین طور پر معلوم ہو جائے گا کہ جمہوریت اور مطلق العنانی کا مسئلہ

اب جدید قومیت اور بین الاقوامیت کے مسئلہ میں ضم ہوگیا ہے، وہ دیکھ لین گے کہ معاملات کا [illegible] کس طرف ہے، اور پھر وہ اپنے لئے کوئی راہ پسند کریں گے، ہوسکتا ہے کہ غور کرنے کے بعد اکثر لوگ جدید قومیت کا اصول اختیار کرلین، لیکن یہ زیادہ قرین قیاس نہیں، بیشتر اصحاب فکر کا رجحان بین الاقوامیت کی طرف معلوم ہوتا ہے، بین الاقوامیت کی حمایت میں عیسائی مذہب کی تمام تعلیمات بھی ہیں، اکثر فلسفیوں کی رائے بھی اسی کی موافقت میں ہے، یورپین مدبرین کی اکثریت بھی اسی جانب ہے، عوام بھی جنھین جدید قومیت کی خطرناک حوصلہ مندیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، غالباً اسی کی حمایت کریں گے، جتنے ہی زیادہ لوگ بین الاقوامیت کو سمجھ کر اختیار کرتے جائیں گے اتنی ہی زیادہ یہ تحریک مضبوط ہوتی جائے گی، لیکن یہ توقع نہیں کیجاسکتی کہ اس کی ترقی مستقل اور غیر منقطع ہوگی، کیونکہ دوسری تحریک طاقتور ہے اور اسے جذبات وتعصبات کی قوت اور زبردست "اغراض" کی حمایت حاصل ہے، بہرحال جن لوگوں نے بین الاقوامیت کا عقیدہ سوچ سمجھ کر اختیار کرلیا ہے، وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ سچائی اور انصاف کے غیر متبدل اصولوں کے ہم آہنگ ہیں، اور چونکہ تمام نیک اندیش مرد اور عورتیں انہی اصولوں کی حامی ہیں، اسلیئے بالآخر یہ اصول کامیاب ہو کر رہیگا۔

"ع۔ ز"

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچوں کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی، جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اس کی زبان بچون کے لائق، دلچسپ اور پسندیدہ ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں قائم کیں، امید ہے کہ اسکولوں، مدرسون اور مکتبوں کے کارکن اور معلم اس کو نصاب تعلیم میں داخل کریں گے، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت عمر

"منیجر"

اخبار علمیہ

تاریخ بنگال

امرت بازار پتریکا کا نامہ نگار لکھتا ہے، کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی طرف سے تاریخ بنگال کی تالیف کا جو کام شروع کیا گیا تھا، وہ تیزی کیساتھ جاری ہے، پہلی جلد کے مختلف ابواب جو ہندو عہد پر مشتمل ہو گی مختلف اشخاص کے سپرد کردیے گئے ہیں، اس جلد کی ادارت پروفیسر آر، سی، مازمدار، ڈھاکہ یونیورسٹی نے قبول کی ہے، لکھنے والون میں بعض اشخاص کے نام حسب ذیل ہیں، جو ابواب انکے سپرد کیئے گئے ہیں، ان کے ناموں کے سامنے قوسین میں درج ہیں (۱) ڈاکٹر گوہا زوالوجیکل سروے آف انڈیا، (بنگال کی مختلف نسلیں) (۲) ڈاکٹر رائے چودھری کلکتہ یونیورسٹی (قدیم تاریخی عہد) (۳) ڈاکٹر باسک، پریزیڈنسی کالج کلکتہ، (سلطنت گپت سے قوم پالا تک قانون اور نظام حکومت) (۴) ڈاکٹر مازمدار (قوم پالا، قوم سینا، اقتصادی تاریخ، اور بنگالۂ عظمیٰ)، (۵) ڈاکٹر رائے کلکتہ یونیورسٹی، (چندر، برمن اور دوسرے چھوٹے چھوٹے خاندان (۶) مسٹر این جی مزمدار، نگراں آثار قدیمہ، (فنون وصنعت)، (۷) ڈاکٹر ڈے، ڈھاکہ یونیورسٹی، (سنسکرت لٹریچر)، (۸) ڈاکٹر چیٹرجی، کلکتہ یونیورسٹی، (ملکی لٹریچر)

دوسری جلد میں بنگال پر مسلمانون کے پہلے حملہ سے لیکر بنگال کے آخری پٹھان فرمانروا داؤد تک کی تاریخ ہوگی، تیسری جلد عہد مغلیہ پر مشتمل ہو گی، جسمیں داؤد سے لیکر جنگ پلاسی تک کے حالات ہونگے، ان دو جلدون کی ادارت سرجادو ناتھ سرکار کے ہاتھ میں ہے مختلف ابواب مندرجہ ذیل اشخاص کو دیئے

گئے ہیں، :- (۱) ڈاکٹر قانونگو ڈھاکہ یونیورسٹی، (مسلمانون کی فتح سے عہدِ بلبن تک، افغانون کا عروج، قانون
اور نظامِ حکومت،) (۲) پروفیسر شرف الدین، راج شاہی کالج (اہل حبش) (۳) سر جادو ناتھ سرکار
(مغلوں کی فتح، معاشرتی اور اقتصادی تاریخ، قانون اور نظامِ حکومت، سیاسی تاریخ، شاہجہان
سے سراج الدولہ تک، جس میں مرہٹوں کے حملے بھی شامل ہوں گے) (۴) حکیم حبیب الرحمٰن، (اشاعت
اسلام اور بنگال میں اسلامی تہذیب و تمدن (۵) پروفیسر سین، شانتی نکیتن (مذہب اور مذہبی حالت)
(۶) پرنسپل داس گپتا، سنسکرت کالج، بشمول پروفیسر دنیش بھٹاچاریا و پروفیسر ضیا ہرن چکرورتی (سنسکرت
لٹریچر)، (۷) ڈاکٹر چٹرجی، کلکتہ یونیورسٹی، (ملکی لٹریچر اور دیسی کہانیان) (۸) ڈاکٹر انعام الحق،
(ہندی اسلامی لٹریچر اور لٹریچر میں مسلمانونکا حصہ) (۹) پروفیسر سین، کلکتہ یونیورسٹی، (بنگال میں پرتگالی
(۱۰) پروفیسر کالی کنکر دت، پٹنہ کالج (علی وردی خان) (۱۱) پروفیسر نرود ھ بھوشن رائے، (سلاطین
تغلق) (۱۲) پروفیسر سین کلکتہ یونیورسٹی، (ملکی لٹریچر) (۱۳) پروفیسر باسو ملک، میرٹھ کالج، (عہد مغلیہ
سے قبل کا مذہب)

اس تاریخ کے ابتدائی اخراجات کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی ایک ہزار روپئے دے چکی ہے،
اسکے علاوہ مسٹر اے، ایف، رحمان وائس چانسلر، ڈھاکہ یونیورسٹی نے جیب خاص سے ایک ہزار کی رقم
اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، ڈاکٹر قانون گو نے، قانونگو پارلائبریری چٹاگانگ
کی طرف سے پچاس روپیوں کا وعدہ فرمایا ہے، امید کیجاتی ہے کہ اس تاریخ کی پہلی اور تیسری جلدین
جولائی ۱۹۳۶ء کے آخر تک چھپنے کے لئے پریس پہنچ جائین گی،

دانتون کی صحت کے لئے مناسب غذا کی تجویز

دانت کے امراض کی شکایت آج تمام مہذب ملکوں میں عام ہے، لٹریری ڈائجسٹ کی تازہ
اشاعت سے معلوم ہوتا ہے، کہ اسوقت امریکہ میں ساٹھ ہزار دندان ساز ڈاکٹر چھ لاکھ آدمیوں کے

علاج میں مصروف ہیں، اس عام شکایت کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ لوگون نے دودھ اور دوسری
غذاؤں کو جنسے دانتوں کو قوت پہنچتی ہے، ترک کر دیا ہے، وسط جون ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی سائنس
امریکہ کے ایک جلسہ میں اس وبا کی جو رونداد پیش کی گئی، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہتیرے امراض جنکا
تعلق بظاہر دانتوں سے معلوم نہیں ہوتا، دراصل انہی کی خرابی سے پیدا ہوتے، اور بڑھتے رہتے ہین
چنانچہ ڈاکٹر میکال (MECALL) نے اپنا تجربہ بیان کیا، کہ انکے پاس پانچ سال کا ایک
لڑکا لایا گیا، جس کے قلب کا فعل نہایت خراب ہو چکا تھا، اور اسکی کمزوری اتنی بڑھ گئی تھی، کہ اُس کے
والدین اُسے کرسی میں اُٹھا کر لائے تھے، معائنہ کرنے پر معلوم ہوا، کہ اُس کا ایک دانت بھی مرض سے
پاک نہ تھا، لہذا سب دانت نکال ڈالے گئے، دو ہی ماہ کے بعد اُسکے قلب کی حالت بالکل درست
ہو گئی، اتنا ہی نہیں، بلکہ اس کے بعد مناسب غذا پر رکھنے سے نئے دانت ایسے عمدہ نکلے کہ انکے
علاج کی ضرورت ڈاکٹر موصوف کی رائے میں آیندہ غالباً کبھی پیش نہ آئیگی، یہ مناسب غذا ڈاکٹر
چارلس ڈرین (CHARLES DRAIN) اور ڈاکٹر جولین بوائڈ (JULIAN BOYD)
کی تجویز کردہ ہے، اور انھیں بھی بالکل اتفاقیہ طور پر معلوم ہو گئی، بعض ذیابیطس کے مریض بچوں کیلئے
وہ مختلف غذاؤں کا تجربہ کر رہے تھے، انھون نے دیکھا کہ جو مناسب غذا ذیابیطس کی رعایت سے
تجویز کی گئی تھی، اُس سے غیر متوقعہ طور پر ان بچون کے دانتوں کی خرابی بھی رُک گئی، یہ دیکھ کر انھون نے اس
غذا کا تجربہ ان بچوں پر بھی کیا، جنکو ذیابطس کی شکایت نہ تھی، تجربہ سے معلوم ہوا کہ خرابی اگر شروع ہو چکی
ہے تو اس غذا کے استعمال سے رُک جاتی ہے، اور مرض بڑھنے نہیں پاتا، یہ غذا حسب ذیل اجزا پر مشتمل ہے :- دودھ
ایک سیر، انڈا، ایک عدد، مچھلی کا تیل ایک چمچہ، (چائے کے چمچہ سے،) مکھن نصف چھٹانک، سنترا ایک عدد، ترکاری
یا کوئی اور پھل تھوڑی سی مقدار میں، تین سال سے پانچ سال کی عمر والوں کیلئے گوشت کا اضافہ بھی کر دیا گیا
ہے، سات سال سے سولہ سال والوں کیلئے یہ چیزین تجویز کی گئی ہیں، یہی سولہ سال سے زیادہ کے لوگوں کے لئے

بھی ہیں، دودھ ایک سیر، انڈے دو عدد، بکری کا گوشت، مچھلی، مرغ، یا کلیجی، سنترا ایک عدد، ٹوماٹو، مچھلی کا تیل ایک چمچہ، مکھن، چھ چمچے، سنترے کے علاوہ کوئی ایک پھل اور روٹی اور آلو کی بھی اجازت ہے، مصالحے، کافی چائے، خشک گوشت، اور اچار سے پرہیز کرنا چاہئے، ڈاکٹر میلکال کا خیال ہے کہ اگر مائیں بچوں کی ولادت سے قبل ہی مذکورۂ بالا غذا کا استعمال شروع کردیں اور ولادت کے بعد بچوں کی پرورش اسی غذا سے کریں، تو دانتوں کے امراض ایک پشت کے اندر ہی تقریباً بالکل دور ہو جائیں گے،

سورج گرہن

۱۹ رجون ۱۹۳۶ء کا سورج گرہن بحر روم سے بحر الکاہل تک کے خطہ میں پوری طرح نمایاں تھا، لیکن سب سے زیادہ نمایاں سائبریا اور شمالی جاپان میں تھا، چنانچہ روس میں اسکے متعلق تیاریاں بہت پہلے سے ہو رہی تھیں تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ عوام کو گرہن کے حالات بتائے جا رہے تھے، رصد خانوں کی طرف سے اس موضوع پر رسالے مقالات آسان زبان میں شائع ہو رہے تھے، حکومت نے بھی تین کتابیں اور بہت سے رسالے شائع کرکے لوگوں کو آنیوالے واقعہ کی نسبت مفید معلومات بہم پہنچانیکی کوشش کی، اس گرہن کا انتظار سختی سے کیا جا رہا تھا، کیونکہ پچھلا گرہن جو فروری ۱۹۳۴ء میں لگا تھا، صرف بورنیو کے گھنے جنگلوں سے دکھائی دیا تھا، جتنا بہتر موقعہ جون ۱۹۳۶ء کے گرہن کا مطالعہ کرنیکے لئے ملا اتنا اب تک کسی گرہن کے لئے میسر نہیں آیا، اسی لئے ایک سال قبل ہی ہیئت دانوں کی بین الاقوامی انجمن نے پیرس میں اجلاس کرکے اس گرہن کے مختلف حصوں کے مطالعہ کیلئے مختلف جماعتیں متعین کردی تھیں تاکہ کوئی حصہ مطالعہ سے رہ نہ جائے اور کسی ایک حصہ کے مطالعہ میں ایک سے زیادہ جماعتیں وقت صرف نہ کریں، چنانچہ منجملہ اور ممالک کے امریکہ، جاپان، انگلستان، فرانس، بلجیم اور پولینڈ کے وفود اس وسیع خطہ میں پھیلے ہوئے تھے، جہاں گرہن پوری طرح نمایاں تھا،

پورا سورج گرہن اب آئندہ ۸ رجون ۱۹۳۷ء کو واقع ہوگا، لیکن صرف بحر الکاہل سے دکھائی دے گا، یکم اکتوبر ۱۹۴۰ء کو دوسرا پورا گرہن جنوبی نصف کرہ کے ایک حصہ سے نظر آئیگا، شمالی امریکہ میں پورا سورج گرہن ۳۰ رجون ۱۹۵۴ء کو دکھائی دیگا، یہ کنیڈا میں واقع ہوگا، ریاستہائے متحدہ امریکہ کی باری ۸ رجولائی ۱۹۵۹ء میں آئیگی جب پورا گرہن نیو انگلینڈ کی ریاست سے نظر آئیگا

ع ز

باب التقریظ والانتقاد

تتمۂ صوان الحکمۃ

مصححہ پرنسپل محمد شفیع ایم اے، پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی، پتہ:- موتی لال بنارسی داس پنجاب سنسکرت بک ڈپو سید مٹھا، لاہور، قیمت ہر سہ جلد:- لعہ

عربی زبان میں ہر قسم کے علوم و فنون کے ماہرین پر الگ الگ کتابیں لکھی گئی ہیں، من جملہ ان کے علوم فلسفہ و حکمت کے ماہرین کے حالات و سوانح پر بھی چند کتابیں لکھی گئی ہیں، گو بتصریح پتہ نہیں چلتا کہ اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب کونسی لکھی گئی ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ عربی میں اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب یحییٰ نحوی کی تاریخ ہے، خواہ اس کا ترجمہ ہو، (فہرست ابن ندیم صہ ۲۹۰ وصہ ۳۰۷، بمصر) اس کے بعد تاریخ اسحاق الراہب (ایضاً ص ۳۴۴) و تاریخ الاطبا اسحاق بن حنین (ایضاً صہ ۲۹۷ وصہ ۲۹۸، وصہ ۱۵ام) لکھی گئی، چونکہ اکثر اطبا حکما ہوتے تھے، اور اکثر حکیم طبیب، اس لئے ان دونوں کے حالات ایک دوسرے کے تذکرے میں ملا جلا کر لکھے جاتے تھے، ان کتابوں کا بھی یہی حال تھا، ان میں زیادہ تر یونانی حکیموں کے حالات اور سوانح تھے،

ابن ندیم بغدادی نے ۳۷۷ھ میں جو فہرست لکھی اس کا ایک باب حکما اور فلاسفہ کے حالات میں ہے، شاید یہ پہلا موقع ہے، کہ دوسرے حکما کے پہلو بہ پہلو مسلمان حکما کو بھی جگہ دی گئی، ابن ندیم کا ایک استاد مشہور حکیم ابوسلیمان محمد بن طاہر سجستانی منطقی تھا، جو بقول شہرزوری ۳۰۰ھ میں

بغداد میں موجود تھا، اس نے صوان الحکمۃ کے نام سے حکماء کے اقوال وسوانح میں ایک کتاب لکھی تھی، اس کتاب کی تالیف کا زمانہ چوتھی صدی کا وسط قرار دینا چاہئے، پانچوین صدی میں قاضی صاعد اندلسی کی طبقات الامم کو بھی اسی سلسلہ کی کڑی سمجھنا چاہیے،

اس زمانہ میں کتاب پر تتمہ اور تتمہ پر تتمہ لکھنے کا رواج تھا، ظہیر الدین علی بن زید بیہقی المتوفی ۵۶۵ھ نے ۵۴۹ھ سے پہلے صوان الحکمۃ پر تتمہ لکھا جس کا نام تتمہ صوان الحکمۃ ہے، اور یہی کتاب اسوقت زیر تبصرہ ہے، چھٹی صدی کے نصف میں ایک اور مصنف نے اس کا اتمام لکھا، جس کا نام اتمام تتمہ صوان الحکمۃ ہے، ساتوین صدی کے آغاز میں شہرزوری نے ان سب معلومات کو نزہتہ الارواح میں کسیقدر اضافہ کیساتھ کھپا دیا، ساتویں صدی کے وسط میں جمال الدین قفطی المتوفی ۶۴۶ھ نے اخبار العلماء باخبار الحکماء کے نام سے اس فن میں ایک عمدہ کتاب لکھی، آٹھویں صدی کے وسط میں تتمہ صوان الحکمۃ کا ترجمہ فارسی میں درۃ الاخبار ولمعۃ الانوار کے نام سے ہوا، اکبر کے عہد میں شہزادہ سلیم (جہانگیر) کیلئے ۱۰۱۱ھ میں شہرزوری کی کتاب کا فارسی میں ترجمہ ہوا، مترجم کا نام مقصود علی تبریزی ہے، اس ترجمہ کا خلاصہ میر سید صدر الدین بن میر محمد صادق نے بہت بعد میں کیا، تبریزی کی کتاب ہندوستان کے اندر دار المصنفین اور دفتر مال حیدر آباد کے کتبخانہ میں اور خلاصہ بانکی پور لائبریری میں ہے،

اس پورے سلسلۂ تواریخ حکماء میں سے کتاب الفہرست کو چھوڑ کر صرف ایک کتاب مختصر اخبار العلماء باخبار الحکماء قفطی یورپ اور مصر میں چھپی تھی، لیکن چند سال ہوئے کہ پنجاب یونیورسٹی کے صیغہ علوم مشرقی کی طرف سے پروفیسر محمد شفیع صاحب نے درۃ الاخبار کو تصحیح و تحشیہ کیساتھ چھپایا تھا، اور اب انھیں نے درۃ الاخبار کی عربی اصل تتمہ صوان الحکمۃ کو چھاپ کر شائع کیا ہے، اس کتاب کے ایک نسخہ کی نقل حیدرآباد کے ایک اور فاضل بھی یورپ سے لائے تھے، اور وہ اسکی تصحیح و طبع کی فکر میں تھے، مگر یہ سعادت پروفیسر محمد شفیع کی قسمت میں تھی، انھوں نے یورپ اور قسطنطنیہ کے مختلف کتب خانون کے نسخوں کے

مقابلہ سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا، اور اوس پر محققانہ حواشی لکھے، اور پنجاب یونیورسٹی نے اوس کو چھاپ کر شائع کیا،

تواریخ حکما کے باب میں دو بڑی دقتیں ہیں، ایک یہ کہ ان کتابوں میں ان کے حالات نہایت ہی مختصر ہیں، بلکہ کہین کہیں توان کے ناموں پر اکتفا کی گئی ہے، دوسری یہ کہ ان کی ولادت اور وفات کے سنین بہت کم ملتے ہیں،

محشی موصوف نے اپنے امکان بھر ان دونوں دقتوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، حواشی میں دوسرے ذرائع سے مترجم لہ کا اگر کوئی حال معلوم ہو سکا ہے تو اس کا حوالہ دیا ہے، اور اون کی زندگی اور وفات کی تاریخ وسنہ کا اگر پتہ لگ سکا ہے، تو اسکو ذکر کیا ہے، ساتھ ہی دوسرے متعلقہ اشخاص کے سوانح کی تشریح بھی کی ہے، کتاب کے مختلف نسخوں کی مختلف قراتوں میں سے صحیح قرأت کی تعین متن میں کی ہے، اور دوسری قراتوں کو حاشیہ میں درج کر دیا ہے، کتاب کے شروع میں فہرست کتاب ہے، اور اخیر میں مزید تشریحی حواشی لکھے ہیں، اور ناموں اور کتابوں کا انڈکس بنا کر شامل کیا ہے، سب سے آخر میں غلطنامہ ہے،

کتاب کی تصحیح اور تحشیہ میں پروفیسر موصوف نے پوری محنت کی ہے، اور حکماء کی جو تصانیف موجود ہیں، اور جن کتبخانوں میں ہیں اونکا پتہ دیا ہے، ارباب نظر جانتے ہیں، کہ اس قسم کے کاموں میں کس دیدہ وری اور دیدہ ریزی کی ضرورت ہے، مصحح محشی نے ان دونوں باتوں کا پوری طرح ثبوت دیا ہے،

کتاب میں کل ۱۱۱ حکیموں کا تذکرہ ہے، حنین بن اسحاق کے حال سے وہ شروع اور زین الدین جرجانی کے حال پر ختم ہوئی ہے، یعنی وہ چھٹی صدی ہجری کے وسط تک کے حکما کے احوال پر مشتمل ہے، مصنف نے حتی المقدور تاریخی ترتیب پیش نظر رکھی ہے، گو اسکی پوری رعایت نہیں کی ہے،

کتاب کی تصحیح اور تحشیہ میں جو محنت کی گئی ہے، اسکی بنا پر وثوق کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ و

کسی یوروپین مستشرق کی محنت سے کم نہیں ہے، حالانکہ کتابوں کے ملنے کی جو آسانیاں یورپ میں ہیں
وہ ہندوستان میں کہاں اور کس کو میسر ہیں؟

بعض مقامات کی نسبت ہمکو کچھ کہنا بھی ہے،:-

صنا پر جس علاء الدولہ فرامرز بن علی کا ذکر ہے، تاریخ بیہق کے ضمنی تذکرہ کے علاوہ جس کا
حاشیہ میں حوالہ دیا گیا ہے، کامل ابن اثیر کے حوادث ۵۱۵ھ میں اس کا ذکر ہے کہ اس نے اس سال
مشہد کے گرد چہار دیواری (سُور) بنوائی تھی، کسی قدر اس کا مفصل حال علامہ شوستری نے مجالس المؤمنین
میں لکھا ہے، اور ۵۳۶ھ اسکی تاریخ وفات بتائی ہے، محشی نے فائت حواشی میں (ص۲۲۲) اس علاء الدولہ
پر جو حاشیہ لکھی ہے، وہ بے محل معلوم ہوتا ہے، کہ وہ علاء الدولہ فرامرز کا حال نہیں، بلکہ اس کے بجائے
علاء الدولہ گرشاسپ کا ہے،

مصنف کو یعقوب کندی کے یہودی یا نصرانی ہونیکا شبہ ہے (ص۴۲) محشی نے چہار مقالہ کا حوالہ دیا ہے، کہ
اس نے مصنف نے بھی اس کو یہودی لکھا ہے، حالانکہ قاضی صاعد اور قفطی نے اسکے مسلمان ہونے اور
مہدی و رشید کے زمانہ میں اس کے باپ کے امیر کوفہ ہونے، اور اسکے دادا اشعث بن قیس کے صحابی ہونے کی
تصریح کی ہے، اصابہ فی تمییز الصحابہ میں ان کا پورا حال مذکور ہے،

یعقوب کندی کے ایک رسالہ کے رامپور میں ہونے کا ذکر محشی نے کیا ہے، (ص۱۹۶) حالانکہ
اس کا ایک اور رسالہ، رسالہ فی الشعاع بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں بھی موجود ہے، اسکا تیسرا
رسالہ تصحیح قول ابسقلاوس فی المطالع بدایون میں چھپا ہے،

تعجب ہے کہ محشی نے طبقات الامم کے مصنف کو فہرست ماخذ میں (ک) اور حواشی میں انکو
(ص۲۵) جابجا ابن صاعد لکھا ہے، حالانکہ صاعد خود اس کا نام ہے، اس کے باپ کا نہیں، اس لئے ہر جگہ
صاعد لکھنا چاہئے تھا،

بعض الفاظ کی صحیح قرأت نہیں ہو سکی ہے، مثلاً ص ۱۱۱ میں ہے، "سا وائک عبد غیرک"
حالانکہ یہ فقرہ بعید المعنی ہے، محشی نے نسخہ غ کے مطابق یہ الفاظ متن میں رکھے ہیں، حالانکہ ک اور ب
میں عبد کے بجائے صحیح طور پر عند تھا، اس کی صحیح قرأت نل میں ہے، اور وہ یہ ہے، "ماذاک عند
غیرک" یعنی تم یہ کہتے ہو، مگر تمہارے سوا دوسرے آدمی کے نزدیک یہ بات یوں نہیں ہے"

ص ۱۳۶ میں ایک شعر ہے، جسکو متن میں اسطرح بقید اعراب لکھا گیا ہے،

فتًی عیشۃً معروفۃً بعد موتہ   لقد دفنوا منہ سقی اللہ قبرہ

عیشۃً معروفۃً پڑھنے سے شعر بے معنی ہو جاتا ہے، بلکہ اس کو عیشہ معروفہ
پڑھنا چاہیے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ ایسے جوان مرد کو دفن کر دیا، جسکی زندگی اوس کے مرنے کے
بعد اوسکی نیکی کے کارنامے ہیں،

ص ۸۲ میں زیجا الذی غلط معلوم ہوتا ہے، الزیج الذی لہ ہو گا، یا زیجہ ہو جیسا کہ اختلاف
قرأت کے حواشی ص ۸۲ میں ہے،

ص ۶۹ کے حاشیہ میں راغب اصفہانی کی تصانیف میں سے تفصیل النشأتین کا چھپ جانا
لکھا گیا ہے، حالانکہ ان کی دوسری کتاب الذریعۃ الی مکارم الشریعہ بھی ۱۳۲۴ھ میں مصر میں چھپ گئی ہے لیکن
اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے،

ابو حاتم مظفر اسفزاری کی تاریخ وفات ۵۰۶ھ (چہار مقالہ) اور ۵۱۵ھ (میزان الحکمۃ خازنی)
کے درمیان متعین کی گئی ہے، مگر خود تتمہ صوان الحکمۃ میں ہے کہ اس نے جو سائنٹفک ترازو بنائی تھی
اور شاہی خزانہ میں پیش کی تھی، اسکو جب سلطان سنجر کے خزانچی نے توڑ ڈالا، تو حکیم مذکور (ابو حاتم مظفر)
اس غم میں مر گیا، سلطان سنجر ۵۱۱ھ میں تخت پر بیٹھا، اس بنا پر ابو حاتم مظفر کی تاریخ وفات ۵۱۱ھ
اور ۵۱۵ھ کے درمیان مقرر کرنی چاہئے،

ص ۸۳ میں کوشیار کی مجمل کا پورا نام چہار مقالہ کے حوالہ سے مجمل الاصول بتایا گیا، اور رامپور لائبریری میں اس کا ہونا لکھا ہے، اس کا دوسرا نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ (حیدر آباد دکن) میں بھی ہے، اور وہاں اوس کا نام مجمل الاحکام فی اصول الاحکام ہے۔

ص ۱۲۸، س ۵ میں عشرین مجلدات کا لفظ متن میں رکھا گیا ہے، حالانکہ صحیح نسخہ وہ ہے جو حاشیہ میں بحوالہ نب، ب لکھا گیا ہے، یعنی مجلدۃ،

تتمہ کا فارسی اڈیشن درۃ الاخبار پروفیسر شفیع صاحب پہلے لیتھو میں شائع کر چکے تھے، اب اوس کو اس سلسلہ کی دوسری کڑی بنا کر دوبارہ ٹائپ میں چھاپا ہے، حواشی وہی ہیں جو طبع اول میں تھے کہیں کہیں ترمیم اور تبدیل کی ہے، مگر تعجب ہے کہ نصیر طوسی کے حال میں تاریخ گزیدہ کے حوالہ سے جو بیان "وعمرش بقول صاحب گزیدہ ... سال و ... ماہ و ... روز بود" پہلے لکھا گیا تھا، اس میں تغیر نہیں کیا گیا ہے، مطبوعہ گزیدہ میں جہاں تک میں نے تلاش کیا یہ نہیں ملا، البتہ ہفت اقلیم رازی میں ہے کہ "مدت عمرش ہفتاد و ہفت سال و ہفت ماہ و ہفت روز بود" جو حساب سے غلط ہے، اور صحیح ۵، سال، ماہ، روز ہے،

حکمائے اسلام کی تاریخ میں غالباً قدما نے کوئی محققانہ کتاب نہیں لکھی، حالات بہت کم لکھے ہیں، سنین سے غفلت برتی ہے، تصانیف کا استقصا نہیں کیا ہے، پھر یہ جو کچھ ہے چھٹی صدی تک ہے، اسکے بعد کی چھ صدیوں میں یہ ادھورا کام بھی نہیں کیا گیا، اور اس دوسرے دور کے اشخاص بالکل زاویۂ خمول میں ہیں، ضرورت ہے کہ پرانے ماخذوں کی جدید تحقیقات سے ایک نئی کتاب اس موضوع پر لکھی جائے، اور اس بڑی کمی کو پورا کیا جائے، معلوم نہیں کس خوش قسمت کی قسمت میں یہ خدمت مقدر ہے،

کتاب کا تیسرا حصہ جو انگریزی دیباچہ و تبصرہ ہوگا زیر طبع ہے،

"س"

ہندوستانی کے چند نئے رسالے

سالِ رواں میں ماہ فروری سے ماہ جولائی ۳۶ء تک ہندوستانی زبان میں حسب ذیل نئے رسالے شائع ہوئے ہیں،

تحقیقِ حق - لکھنؤ، مدیر جناب سید علی صفدر صاحب ایم اے ال ال بی ۴۰ صفحے قیمت سالانہ ۲ روپیہ، فی پرچہ ۵ ر پتہ:- امپیریل بکڈپو نمبر ۱۹، امین الدولہ پارک، لکھنؤ،

یہ علوم فلسفہ و کلام کا ماہوار رسالہ ہے، جس میں عقلی دلائل سے ادیان و مذاہب کی تحقیق کی جاتی ہے، اس کے کارکن قدیم اسلامی فلسفہ و علم کلام کے مباحث کو دورِ حاضر کے نئے تعلیم یافتہ طبقوں کے فہم و مذاق کے مطابق پیش کرتے ہیں، اور اس طریقہ سے دیگر مذاہب کے مقابلہ میں دین اسلام کی برتری عقلی دلائل سے دکھاتے ہیں، اگرچہ نفس واقعہ کے لحاظ سے احقاقِ حق کے لئے ان متکلمانہ مباحث و نظریات کو اساس حق قرار دینا ایک ذوقی مسئلہ ہے، لیکن جن لوگوں کی ذہنیت کے مقابلہ میں انھیں پیش کیا جاتا ہے، ان کی تشفی کا پورا سامان ان میں بہم پہنچایا جاتا ہے، اور اس حیثیت سے ایک قابلِ قدر خدمت انجام پا رہی ہے، رسالہ کے مضامین انگریزی و ہندوستانی دونوں زبانوں میں ضرورت و محل کے لحاظ سے چھاپے جاتے ہیں، "تحقیق مذہب" کے عنوان سے مدیر کا ایک مضمون دونوں زبانوں میں چھپ رہا ہے، جس میں عیسائی، آریہ اور ملحد وغیرہ فرقوں کے درمیان وجود باری تعالیٰ پر دلائل قائم کئے گئے ہیں، رسالہ کے کاغذ اور لکھائی چھپائی پر مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

شمیم، پٹنہ، اڈیٹر جناب تمنائی، حجم ۴۸ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت سالانہ ۲ روپیہ، فی پرچہ ۳ ر پتہ:- یونس منزل، اکزیبیشن روڈ، پٹنہ،

یہ ادبی ماہنامہ ہے، جو پٹنہ کے ایک ہونہار نوجوان اہل قلم کے جذبۂ خدمت ادب سے نکلا ہے، ادبی مضامین اور افسانے خاصے ہوتے ہیں، نیز انگریزی کے علمی مضامین اور کتابوں کے ترجمے چھپتے ہیں، رسالہ کے دائرۂ عمل میں

سیاسیات داخل ہیں، ہر ماہ بین الاقوامی وہندوستانی سیاسیات پر رائے زنی کی جاتی ہے، مضامین اور افسانوں میں سوشلزم کی حمایت کی جھلک نظر آتی ہے، اس سلسلہ میں اگر گرم فقرے بھی قلم سے ٹپک پڑیں تو اسے نوجوان ادیب کی نوجوانی کے قلم کی تیزی سمجھنا چاہئے، توقع ہے کہ یہ رسالہ صوبہ کے نوجوانوں میں ادبی مذاق پیدا کریگا، اور رفتہ رفتہ ادارت کا تجربہ بھی آجائے گا،

حیات ۔ مدراس، مدیر جناب محمد عبد الحمید صاحب حمید، ۱۶ صفحے، قیمت ار پتہ:۔ بھمنی پریس ترنکیہ ڈی ہائی روڈ، مدراس، صوبہ مدراس سے ہندوستانی زبان کے خاصے رسالے نکل رہے ہے

صوبہ مدراس سے ہندوستانی زبان کے خاصے رسالے نکل رہے ہیں، یہاں کے مفکروں میں اس زبان کی خدمت اور مسلمانوں کو سیاسی وتعلیمی اصلاح وترقی کے لئے ابھارنے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے، چنانچہ یہ نیا ماہنامہ "حیات" بھی انہی مقاصد کے ساتھ ماہ محرم سے جاری ہوا ہے، دار المصنفین کے سابق رفیق مولانا ابو الجلال ندوی اور چند دوسرے اہل علم اس رسالہ کے نگراں ہیں، اور پہلے نمبر میں ان کے مضامین نثر ونظم درج ہیں،

شباب مشرق کلکتہ اڈیٹر جناب شمس شیدائی و ڈاکٹر محمد یوسف صاحب خیاؔل، ۳۲ صفحے، قیمت عام ہر پرچہ ۲ر پتہ:۔ نمبر ۳۶، سنٹرل ایونیو، روم ۸، کلکتہ،

یہ رسالہ بنگال میں ہندوستانی زبان وادب کی خدمت اور "حق کی اشاعت" کے لئے جاری ہوا ہے، جس میں معمولی اور اوسط درجہ کے ادبی مضامین چھپتے ہیں،

اتحاد اسلامی، رامپور اڈیٹر جناب دائم جلالی، ۵۲ صفحے، قیمت سالانہ عہ ہر پرچہ ۲ر پتہ:۔ بازار صفدر گنج رامپور،

اس میں عام فہم مذہبی، اصلاحی مضامین تراجم اور تاریخی قصص وحکایات شایع ہوتے ہیں،

"ر"

مطبوعات جدیدہ

انقلاب روس، از جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ناشر ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ملنے کا پتہ:۔ سول ایجنٹ کتابستان الہ آباد، حجم ۲۵۰ صفحات، قیمت: عار

روس کا جدید انقلاب، دنیا کی تاریخ میں صرف سیاسی اہمیت نہیں رکھتا، اسکے علمبردار ایک جدید تمدن، نئی معاشرت، اور اعجوبۂ روزگار نظام اخلاق کی نئی طرح ڈالنے کے بھی دعویدار ہیں، چند دنوں پہلے تک روس کے صحیح حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے ذرائع ہمارے پاس مفقود تھے، اس کے متعلق تصنیفات، مضامین اور سفرنامے زیادہ تر ذاتی رجحانات کے ماتحت سیاسی اغراض کے لئے لکھے جاتے تھے، ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ حکومت روس کے تعلقات، دول یورپ سے نئے سرے سے استوار ہوئے، پروپیگنڈے کا دور ختم ہوا، اور واقعات اپنے اصلی رنگ میں ظاہر کئے جانے لگے، لیکن اسوقت تک ہندوستانی زبان میں اس کے عصر جدید پر کوئی قابل اعتماد تصنیف موجود نہ تھی، جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے یہ ضرورت پوری کی،

موصوف نے اس کتاب میں بالشویک نظام حکومت، آئین وقوانین، ملکیت، صنعت وحرفت اور زراعت کے متعلق بالشویک اصول وعقائد اور ان کی عملی سرگرمیوں، روس کی موجودہ تعلیمی جدوجہد اور مذہب، نظام معاشرت اور اخلاق کے متعلق بالشویک عقائد، اور عملی تجربے، ان کی حمایت ومخالفت دونوں سے قطع نظر کرکے دکھائے ہیں، اس کتاب میں مصنف کی حیثیت ایسے مورخ کی ہے، جو ذاتی رجحان سے علحدہ رہ کر جو واقعہ جس طور پر پیش آیا، اوسے سادہ طریقے سے بیان کردے، او

وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئے ہین،

پنڈت جی کی اس تصنیف میں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے، ادھر پچھلے چند سالوں میں ان کی جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں اونھوں نے ہندی کے نوپیدا نامانوس الفاظ بہ کثرت استعمال کیے تھے، چونکہ پنڈت جی ہندوستانی زبان کے کہنہ مشق اہلِ قلم تھے اسلئے معارف نے پچھلے موقعوں پر ایک سے زیادہ مرتبہ انھیں ٹوکا، اور موصوف نے بعض تحریرون میں اپنا طرزِ عمل حق بجانب دکھانے کے لئے ہماری گذارشوں کے جواب بھی دیئے، لیکن موصوف کی یہ تازہ تصنیف دیکھ کر خوشی ہوئی، کہ انھوں نے یہ کتاب اپنی اسی پُرانی صاف، شُستہ، اور رواں زبان میں لکھی ہے، جس کے وہ قادر الکلام اہلِ قلم ہین، اگرچہ ٹائپ میں چھپنے کے باوجود چھپائی کی بعض قابلِ افسوس غلطیاں باقی رہ گئی ہیں،

سفرنامۂ مغرب اقصیٰ، ازجناب قاضی میر ولی محمد صاحب بھوپال، حجم ۱۶۶ صفحات،

قیمت درج نہیں،

یہ اقصائے مغرب کا عبرت انگیز سفرنامہ ہے، اسلامی اندلس کے دور میں مغرب و اندلس باہم قلب و جگر کی حیثیت رکھتے تھے، اور مغرب میں بھی بعض بڑی بڑی جلیل القدر اسلامی سلطنتیں قائم تھیں، پھر اندلس کے اجڑنے کے بعد بے خانمان اندلسی خاندانوں نے اسی سرزمین میں آکر پناہ لی، اور آج بھی یہان مسلمانون کی بڑی آبادی موجود ہے، جو اگرچہ فرانس و اسپین کے پنجۂ استعمار میں گرفتار ہے، لیکن ان کے وجود سے اسلامی عہد کی یاد باقی ہے، اسلئے اسلامی تاریخ سے وابستہ دلوں میں اس سرزمین کی طرف غیر معمولی کشش پائی جاتی ہے، میر ولی محمد صاحب نے جنھیں اندلس، افریقہ، مغرب اور سسلی کی تاریخ سے عشق سا ہے، جہاں دوسرے اجڑے دیاروں کی زیارت کی، وہاں وہ کشاں کشاں صحرائے مغرب میں بھی جا پہنچے، اور یہان کے ایک ایک تاریخی مقام کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا، اور سلاطین علما و اکابر کی قبریں تلاش کیں، اور اپنے سفرنامہ میں ان کے نشانات بتائے، اسی تلاش و جستجو میں وہ عہدِ اسلامی کے مغرب کے مشہور شہر اور دورِ حاضر کی گمنام آبادی اغمات میں بھی بہ ہزار دشواری وارد ہوئے، یہان اندلس کا مشہور عبادی تاجدار المعتمد آسودۂ خواب تھا، اس جلیل القدر فرمانروانے اندلس کے اسلامی دور کے اخیر میں اسے نئے سرے سے زندہ کیا تھا، اور اس کے نام سے یورپ کی سلطنتیں کانپ اٹھتی تھیں، لیکن افسوس کہ آج اغمات میں اسکی قبر کا بھی نام و نشان باقی نہیں رہا، زائر نے تاریخ کے دفتر کھولے اسکی قبر کی جائے وقوع کے متعلق تاریخ کا بتایا ہوا ایک ایک نشان دیکھا، قدیم تاریخی اور موجودہ نقشون سے سرزمین کو ملایا، لیکن اس جلیل القدر فرمانروا کی آخری خوابگاہ کا پتہ نہ چل سکا، زائر سیاحِ عالم ابنِ بطوطہ کی قبر کی زیارت کے شوق میں بھی روانہ ہوا، اسکی قبر ایک سکونتی مکان کے ایک بوسیدہ حجرے میں بتائی گئی، زائر نے وہان پہنچکر دیکھا، کہ اس کی قبر کی خام زمین مسطح ہو چکی ہے، اور چند اشخاص اس پر چٹائی بچھا کر بیٹھے ہوئے ہیں،

فاضل مصنف نے مغرب کی آبادیوں کے موجودہ تمدنی حالات اور یہان کے مسلمانون کے تمدنی، سیاسی اور معاشرتی حالات کا نقشہ بھی تفصیل سے کھینچا ہے، جو اپنی جگہ کچھ کم عبرت آموز نہیں، یہ پورا سفرنامہ گویا ایک حسّاس دردمند مسلم دل کے جذبات و مشاہدات کا آئینہ دار ہے،

الدّین (عربی) از مولانا عبد القدیر صاحب، بدایونی، پتہ نمبر مکان نمبر ۴۴۴، محلہ رکاب گنج، عقب ڈیوڑھی، غالب گنج حیدر آباد، دکن، حجم ۲۳۱ صفحے، قیمت: ۔عار

یہ سُنی عقائد و ایمانیات و حنفی مسائل عبادات و مشرب صوفیۂ کرام کے متعلق کتاب و سُنت کے متون و مآخذ کے اقتباسات کا ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے، کتاب چار ابواب کتاب العلم، کتاب الایمان کتاب الاسلام اور کتاب الاحسان میں تقسیم ہے، جن میں محنت و عرق ریزی کے ساتھ سنی، حنفی و صوفی مذہب و مشرب کے متعلق آیات و احادیث کے متون، بغیر کسی تمہید و شرح و توضیح کے بہ ترتیب جمع کئے گئے ہیں، جن مسائل میں مؤلف موصوف کو کتبِ صحاح میں احادیث دستیاب نہ ہو سکی ہین، ان

میں دیگر مسانید کی طرف رجوع کرکے ذوق وحال کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا گیا ہے،

دوخدائی خدمتگار، مترجمہ جناب محمود علی خانصاحب حجم ۹۹ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت ۱۲ر

پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی،

اس میں صوبہ سرحد کے مشہور محب وطن بھائیون جناب ڈاکٹر خانصاحب (ایم آر سی ایس لندن) اور سرحدی گاندھی خان عبد الغفار خان کے مختصر سوانح حیات گاندھی جی کے سکریٹری جناب مہادیو دیسائی نے اخلاص ومحبت سے لکھے ہین، جس میں ان کے خاندانی وتعلیمی حالات سے لیکر ان کے دورِ حاضر تک کی سرگرمیان دلچسپ انداز میں بیان کی ہین، جن میں ان کے ایثار وقربانی اور وطنی تحریک کے سلسلہ میں صوبہ سرحد میں ان کے کارنامے خاص طور پر نمایان کئے گئے ہین، نیز ان الزامات کی تردید وزنی دلائل سے کی گئی ہے، جنکو حکومت نے وقتاً فوقتاً اپنے بیانون میں ان بھائیوں کے سر عائد کیا تھا، رسالہ میں گاندھی جی کی ایک مختصر تقریب بھی چھپی ہے، ترجمہ سلیس اور روان ہے،

زوال الامت، از جناب سید جمیل صاحب حجم ۴۸ صفحے، تقطیع چھوٹی قیمت ۴ر

پتہ:۔ جناب حکیم سید عبد الجلیل صاحب، ڈاکخانہ جرول، ضلع بہرائچ، (یوپی)،

اس رسالہ میں مسلمانون کے عہدِ اول میں ترقی کرنے کے اسباب دکھائے گئے ہین، کہ وہ قرآن مجید کی تعلیمات پر عمل پیرا تھے، اس سلسلہ میں قرآنی تعلیمات کو علیحدہ عنوانوں سے بیان کرکے ان سے موجودہ زمانہ میں مسلمانون کی دوری دکھائی گئی ہے، اور پھر بتایا گیا ہے کہ مسلمان قرنِ اول کے جذبۂ ایمانی، جوشِ سرفروشی، اور حقیقی مساوات کا جذبہ پیدا کرنے، فرقہ دارانہ اختلافات سے علیحدہ ہونے، مسلمانون اور غیر مسلمون کے لئے نمونۂ اخلاق بننے، اسلامی تہذیب شائستگی اختیار کرنے، اور صنعت اور تجارت کو ترقی دینے سے حقیقی ترقی کا عہدِ زرین واپس لوٹا سکتے ہین، اس لئے مسلمانون کا یہ دورِ زوال دراصل دوسری قومون کے برخلاف اپنے پچھلے شاندار ماضی کی

کی طرف واپس جانے سے بدل سکتا ہے،

مکتوباتِ امجد، مرتبہ جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی، پتہ شمس المطابع، عثمان گنج، حیدر آباد، ۵۹ صفحے قیمت:۔ ۸ر

یہ حکیم الشعرا حضرت امجد حیدر آبادی کے چند خطوط کا مجموعہ ہے، ان میں بھی موصوف کا وہی خاص رنگ نمایان ہے، جو ان کی تصنیفات ورباعیات میں نظر آتا ہے،

احکام اسلام، از مولوی کفیل احمد صاحب کرتپوری، ناشر رائل ایجوکیشنل بک ڈپو جامع مسجد دہلی، حجم ۲۰۰ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت:۔ عہ ر

اس میں اسلام کے عقائد و ایمانیات کے معلومات کسی قدر تفصیل سے اور عبادات کے مسائل اجمال کیساتھ درج کئے گئے ہیں، رسالہ کا طریقۂ ادا عام فہم اور پیرایۂ بیان دلنشین ہے،

قوت القرآن، از جناب واحدہ خانم مسلم ویلوری پتہ نمبر ۲۵ جدید بمبو بازار بنگلور سٹی، ۹۴ صفحے، قیمت:۔ ۶ر

اس میں آنحضرت صلعم کی سیرت پاک، اور قرآن مجید کی تعلیمات سے دکھایا گیا ہے، کہ انہی کی پیروی کرکے مسلمان "قوت" حاصل کر سکتے ہین، جس سے سربلندی حاصل ہوگی،

اساس القرآن، از جناب واحدہ خانم مسلم ویلوری پتہ نمبر ۲۵، جدید بمبو بازار بنگلور سٹی، حجم ۶۶ صفحے، قیمت:۔ ۱۰ر

اس میں سورۂ فاتحہ کی آیات کے معانی و مطالب بیان کئے گئے ہیں،

دوزخ کا کھٹکا، از مولینا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماے ہند، ناشر منیجر دینی بک ڈپو، کوچہ ناہر خان، دہلی، حجم ۱۳۶ صفحات قیمت ۱۲ر

اس رسالہ میں منہیاتِ شرعی سے متعلق تقریباً نوسو سے زائد حدیثین بہ ترتیب عنوان جمع کی گئی

ہیں اکثر مقامون پران کی تشریح بھی درج کی گئی ہے، حدیثوں کے متن و شرح کی عبارتوں میں امتیاز رکھا جاتا تو بہتر ہوتا، یہ مسلمانوں کی تہذیب کی ضروریات کے لئے کارآمد رسالہ ہے، جو مقبول ہو چکا ہے، اور اس کا دوسرا اڈیشن شائع کیا گیا ہے،

پاک زندگی، از مولینا احمد سعید صاحب، ناشر منیجر دینی بک ڈپو کوچہ ناہر خان، دہلی، ۴۸ صفحے، قیمت: ۔۔/۴ر

یہ مولینا احمد سعید صاحب دہلوی کے تین مضامین "فطرۃ سلیمہ" (یعنی حضرت ابراہیمؑ کے سوانح پر ایک نظر) "حیاتِ طیبہ" (سیرتِ پاک کا بیان) اور "رسالہ فضائلِ درود" کا مجموعہ ہے،

ہادی عالم، از جناب حاجی نبی احمد کرتپوری، ناشر سکریٹری سیرت کمیٹی، بریلی،

اس رسالہ میں آنحضرت صلعم کی سیرتِ پاک بیان کی گئی ہے، رسالہ مفت تقسیم کیا گیا ہے،

آئینۂ حق نما، از مولوی محمد امین صاحب خوشابی، پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، لاہور، قیمت: ۔۔/۴ر

اس میں اسمائے حُسنیٰ کی منظوم شرح کی گئی ہے، اور ہر اسم سے متعلق مختلف معلومات درج کی گئی ہیں،

روحِ جذبات، از جناب خادم اجمیری، پتہ منتظم محی الاوقاف معینی گدڑی شاہی انجمن جہالرہ، اجمیر، ۹۰ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت درج نہیں،

یہ جناب خادم اجمیری کے تازہ کلام کا مجموعہ ہے، جو دو عنوانوں "عقیدت" و "محبت" کے نام سے مرتب کیا گیا ہے، پہلا حصہ حمد و نعت اور منقبت خواجگانِ چشت کی منقبت میں ہے، دوسرا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے، کلام میں روانی و پختگی ہے،

تسخیر یاس، ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، ۳۲ صفحے، قیمت: ۔۔/۵ر

یہ مولوی اشرف الدین صاحب یاس ٹونکی کے ابتدائی دورِ شاعری کے کلام کا مجموعہ ہے، جسے نفاست کیساتھ چھاپا گیا ہے،

"ر"

دارالمصنفین کی ادبی کتابین

[illegible] حصہ اول، جس میں قدماء کے دور سے لے کر [illegible] تک اردو شاعری کے تاریخی تغیرات و انقلابات [illegible] کے مشہور اساتذہ کے کلام [illegible] کی گئی ہے، اور ہر دور کے [illegible] و مقابلہ کیا گیا ہے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ [illegible] معارف پریس، ضخامت ۴۴۵ صفحے، قیمت للعہ [illegible] عبد السلام ندوی،

[illegible] دوم، جس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی [illegible] مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت [illegible] گئی ہے، کاغذ اور کتابت عمدہ، ضخامت ۴۵۹ [illegible] قیمت: ۔للعہ

[illegible] اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری [illegible] اور عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور [illegible] منتخب اشعار، اردو میں شعراء کا سب سے مکمل تذکرہ [illegible] آبِ حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے [illegible] داکبر تک کے حالات، ضخامت ۵۴۸ صفحے، [illegible] از مولنا سید عبد الحئی صاحب مرحوم،

[illegible] شبلیؒ، مولنا شبلی مرحوم کے دوستون، [illegible] شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ جس میں مولنا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات [illegible] یہ درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ [illegible] طبع دوم،

[illegible] اول، ضخامت ۴۴۳ صفحے، قیمت: ۔ عہ/۱۲ر

[illegible] دوم، ۲۶۱ ۔ ۔ عہ/۱۲ر

موازنۂ انیس و دبیر (از مولنا شبلیؒ) اردو کے مشہور باکمال شاعر میر انیس کی شاعری پر ریویو، اردو میں فصاحت و بلاغت کے اصول کی تشریح، مرثیہ کی تاریخ، میر انیس کے بہترین مرثیوں کا انتخاب اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ، اردو میں اپنے فن میں یہ پہلی کتاب ہے، ضخامت ۲۸۴ صفحے، قیمت: عہ/ ر

کلیاتِ شبلی (اردو)، مولنا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں، جو کانپور، ترکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں یکجا ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کے چہل سالہ جد و جہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ، ضخامت ۱۳۰ صفحے، قیمت: ۔ عہ

افاداتِ مہدی، ملک کے نامور انشاپرداز مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی کے ۳۰ مضامین کا مجموعہ مع مقدمہ و ضمیمہ جات، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت: ہیے، حجم ۳۷۵ صفحے،

سرگذشت ادب ترکی، جس میں ترکی ادب کی مختصر اجمالی تاریخ دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے، ۲ر کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں، (از مولنا سید ریاست علی ندوی)

دار المصنّفین کی تاریخی کتابیں

تاریخ صقلیہ جلد اول: مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی اور اسپین کی طرح اسکو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا، اور تقریباً پانسو برس تک اس سے وابستہ رہے، مگر افسوس ہو کہ اس کی کوئی تاریخ اردو انگریزی میں کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی، چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اسکی تاریخ مرتب کیگئی ہو، جن میں سے پہلی جلد اب شائع ہوگئی ہو، جو سیاسی سرگذشت پر مشتمل ہو، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی و اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج، اسلامی حکومت کے خاتمہ اور صقلیہ و جزائر صقلیہ میں مسلمانوں کے مصائب جلاوطنی کا تفصیلی مرقع دکھایا گیا ہو، ضخامت مجموعی ۷۰۴ صفحے کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت: للعہ جلد دوم زیر طبع ہو، مرتبہ سید ریاست علی ندوی،

تاریخ فقہ اسلامی، مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جسمیں ہر دور کی فقہ اور فقہا پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہو جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہو، حجم ۴۰۰ صفحے، قیمت: للعہ مترجمہ مولانا عبد السلام ندوی،

رقعات عالمگیر، اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط اور رقعات جو شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم و ادب، سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ضخامت ۲۹۷ صفحات، چھپائی لکھائی کاغذ بالخصوص ٹائٹل نہایت دلفریب، قیمت: للعہ مرتبہ سید نجیب اشرف ایم اے ندوی،

مقدمۂ رقعات عالمگیر، اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہو جس سے اسلامی فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشا کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشا، اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی ہے، لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ، ضخامت ۷۰۸ صفحے، قیمت: صہ مصنفہ سید نجیب اشرف ایم اے، ندوی،

الفاروق یعنی حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف اور طرز حکومت صحابہ کے فتوحات، طریقۂ حکومت، عراق و شام، مصر و ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر،

مولانا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہو، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گراں پایہ کتاب کے بیسیوں اڈیشن فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہو، جو حرف بحرف نامی پریس کا ہو بہو کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائٹل، ضخامت ۳۱۲ صفحے، قیمت: للعہ

خلفائے راشدین، سیر المہاجرین کا حصۂ اول، یہ چاروں خلفاء کے ذاتی فضائل اور مذہبی و سیاسی کارناموں اور فتوحات کا مجموعہ ۴۸۰ صفحے قیمت: ؎ از مولانا حاجی معین الدین ندوی

(دار المصنّفین کی کتابوں کی مفصل فہرست دفتر دار المصنّفین اعظم گڈہ سے طلب کیجئے)

مسعود علی ندوی، منیجر دار المصنّفین اعظم گڈہ

عدد ۳	ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء	جلد ۳۸

مضامین

شذرات

ہمارے حیدرآبادی فاضل دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ابھی اسی جون میں افغانستان کے سفر سے واپس آئے ہیں، وہاں کے نوجوان اہل علم و ادب کے روز افزوں ذوق و شوق و انہماک کو دیکھ کر وہ بیحد متاثر ہوئے، لکھتے ہیں:-

انجمن ادبی کے ارکان کا جوش عمل دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا ...... ہر رکن اس کوشش میں مسابقت کر رہا تھا کہ وہ کسی نئی چیز کا ترجمہ کر ڈالے، باوجود بے سامانی کے ان کی کارکردگی حیرت انگیز ہے ...... انہماک پر حیرت اور رشک ہے، اور جی چاہتا ہے کہ کاش ان لوگوں کو چرا لینا ممکن ہوتا،

—————

لیکن ہمارے نوجوان فاضل دوست کو دیکھ کر کابل کے نوجوان اہل قلم طبقہ پر کیا اثر پڑا، وہ افغان ادیب فاضل جناب سرور خاں گویا کے عنایت نامہ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے،

"چند روز قبل پروفیسر حمید اللہ خاں تشریف آوردہ بودند، نامۂ مبارک شمارا زیارت کردم، تا اندازۂ کہ مقدور عاجزانہ بود بایشاں مساعدت نمودہ از ہیچگونہ یاوری دریغ نہ کردم، زیرا شخص نامبردہ مردے بود فاضل وکریم النفس ودارای خلق نیکو و اطوار جمیل و خجستہ، درحقیقت تمثال اخلاق و مثال زندہ و روشنی از تتبع و تفحص در راہ علم و دانش بشری، برائے تمام جوانان سرمشق خوبے است، خداوند امثال ایشاں را در دنیاے اسلام بیشتر کند و زحمات شان را پاداش جمیل بدہد...."

ہمارے افغان دوست کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی اس اندرونی تجویز کی کہ وہ وہاں کے چند افغان

نوجوان اہل قلم کو چرا کر ہندوستان لانا چاہتے ہیں، بروقت خبر نہ ہو سکی، ورنہ وہ بہت آسانی سے وہیں چرا لئے جاتے اور حیدرآباد کی ریاست کو اپنے ایک ہنگی پروفیسر کے چوری جانے پر خسارۂ عظیم برداشت کرنا پڑتا،

—————

ادیب فاضل سرور خاں گویا کے خط سے یہ معلوم کر کے بیحد خوشی ہوئی کہ انھوں نے حکیم سنائی کے کلام کا ایک نہایت قدیم و نادر مجموعہ دریافت کیا ہے، جس کی کتابت حکیم سنائی کی وفات کے پچاس برس بعد ہوئی ہے، اس مجموعہ میں حکیم ممدوح کی حسب ذیل تصانیف ہیں، کارنامۂ بلخ، عشق نامہ، عقل نامہ، بہرام و بہروز، عفو نامہ اور غریب نامہ، ہمارے دوست اس مجموعہ کو جشن فردوسی کے موقع پر ایران لے گئے تھے، وہاں کے فضلاء اس کو دیکھ کر بیحد محظوظ ہوئے، اس کا کوئی نسخہ ایران میں نہ تھا، امید ہے کہ ہندوستان کے فضلاء بھی اس "گنج مخفی" کے ظہور پر بیحد خوش ہونگے،

—————

جاپان سے پروفیسر برلاس اپنے ایک عنایت نامہ میں لکھتے ہیں:-

"معارف کے مارچ نمبر میں ساقی پر تبصرہ کرتے ہوئے، ادارت سے ایک غلطی ہوئی ہے، میں نے دو جاپانی پروفیسروں سے اور دو طلبہ سے اس نمبر کے لئے مضمون لکھوائے تھے، ان صاحبان نے خود ہندوستانی میں لکھے تھے، میں نے ترجمہ نہیں کیا، نیز میں کالج میں استاد اردو نہیں، بلکہ استاد ہندوستانی ہوں"

ہندوستانی کے حامی یہ سنکر کیسے خوش ہونگے، کہ ان کی زبان مشرق اقصیٰ کے گوشوں تک پہنچ چکی ہے، اور نیز یہ کہ لفظ اردو کی تنگی اور اسکی جگہ لفظ ہندستانی کی وسعت ہندوستان کے باہر بھی اب تسلیم کی جانے لگی، اور سمجھا جانے لگا کہ ہندوستان کی مشترک زبان کا صحیح نام ہندستانی ہے نہ کہ اردو!

—————

اسی خط میں پروفیسر برلاس نے جاپان میں اسلام کی اشاعت کی نسبت چند فقرے لکھے ہیں، اور بتایا ہے کہ یہاں بعض لوگ کس طرح غلط پروپگنڈے سے دنیاے اسلام میں غلط خبریں پھیلاتے ہیں، اور مسلمانوں کو حقیقت سے بیخبر رکھتے ہیں، جاپان میں درحقیقت صحیح اسلامی خدمت کی توقع اگر کسی سے کیجا سکتی ہے، تو وہ کوبے کی مسجد

اور اس کے مخلص کارکن ہیں،

مولنا شبلی اور مولنا حمید الدین صاحب کی تکفیر کے فتوی پر جن لوگوں نے دستخط کئے تھے ان میں سب سے ممتاز شخصیت حضرت مولنا اشرف علی صاحب تھانوی کی تھی، مولوی عبد الماجد صاحب دریابادی اور دوسرے دوستوں کے خطوط اور اخبار صدق لکھنؤ سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ حضرت مولنا نے فتوی کے بعض جوابی تشریحی مضامین پڑھنے کے بعد اپنے مسلکِ توسع کی بنا پر ان دونوں بزرگوں کی تکفیر کے فتوی سے رجوع فرمایا،

اس زمانہ میں جب کہ اعترافِ حق کبریت احمر ہے، حضرت مولانا تھانوی کی یہ حق پسندی بیحد قابلِ قدر رہی،

ہمارے عزیز بدر الدین چینی صاحب نے مصر سے ہم کو ہمارے چینی بھائیوں کی حمیت دینی کی ایک تازہ مثال لکھی ہے، مشہور انگریز مؤلف ویلز نے اپنی کتاب دی اوٹ لائن آف دی ورلڈ ہسٹری میں اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ السّلام کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا، اس کا ترجمہ چینی زبان میں بھی شائع ہوا جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے کمرشل پریس کے مالک کو جس کا پریس چین میں سب سے بڑا ہے اور جو خود بھی بڑا عالم ہے لکھا کہ اس حصہ کو جس میں رسول اللہ صلعم کی شان میں بے ادبی ہے نکال ڈالا جائے، اور واقعات کے مطابق وہاں ایک مبسوط حاشیہ لکھدیا جائے، مسلمان اس احتجاج میں نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ اس پریس سے اور حقیقی تاریخی کتابیں نکلی تھیں ان کی بھی نظر ثانی ہونے لگی، اور صاحبِ مطبع نے اپنے اثر سے شنگھائی کے پریس کی کمیٹی جنرل کو بھی آمادہ کر دیا کہ اہل مطبع کو متنبہ کر دیا جائے کہ اسلام کے متعلق جب کوئی مضمون یا کتاب لکھی جائے تو چھپنے سے پہلے انجمن علوم اسلام (شنگھائی) کے پاس بھیجدی جائے، اور اسکی منظوری اور تصدیق کے بعد اس کے چھاپنے کی اجازت دیجائے، ہم بھی اپنے چینی بھائیوں کو ان کی اس حمیتِ دینی پر مبارکباد دیتے ہیں،

مقالات

سفرِ گجرات کی چند یادگاریں

جولائی ۱۹۳۳ء میں بڑودہ کی مجلس سیرت کے سلسلہ میں مجھے گجرات کے سفر کا اتفاق ہوا، اس خطہ کو ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں چند خصوصیتیں حاصل ہیں، اوّل یہ کہ عرب اور ہندوستان کے باہمی تعلّقات کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا، دوسرے یہ کہ عرب سے جو علماء دریا کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوتے تھے وہ پہلے یہیں اُترتے تھے، موقع ملتا تو آگے بڑھتے ورنہ یہیں سے لوٹ جاتے تھے ہندوستان سے جو علماء عرب جانا چاہتے تھے، وہ اسی راستہ سے سفر کرتے تھے، اس صوبہ کے سینکڑوں دیہات حرمین محترمین کے مصارف کے لئے وقف تھے، دوسرے ملکوں سے جو نادر اور تحفہ چیزیں یہاں آتی تھیں وہ پہلے یہیں پہنچتی تھیں، حج کے لئے ہر سال ہزاروں علماء، امراء، اور عام مسلمان اسی راہ سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوتے تھے،

اخیر زمانہ میں سلطان عالمگیر اور سیواجی کی سیاسی کشمکش کا میدانِ جنگ یہی خطہ تھا، اور اسلئے سلطانی لشکر کا پڑاؤ اکثر یہاں رہتا تھا، اور اس تعلّق سے یہ صوبہ کبھی پورے ہندوستان کا دار السلطنة بنجاتا تھا، اور ہر قسم کے اہلِ کمال ادھر کا رخ کرتے تھے،

دکن و گجرات کے علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے، اور جو ہے وہ ہندوؤں کی کثرت

زور وقوت اور سیلاب تمدن میں غرق ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہندوستان کے علمی و مذہبی وسیاسی مرکز یعنی ہندوستان خاص سے وہ بہت دور ہے، اس لئے یہاں کے دیہاتوں اور قصبوں میں مسلمانوں کی حالت قابلِ رحم تھی، سلطان عالمگیر کی دور بین نگاہوں سے ان وجوہ واسباب کا نتیجہ چھپا نہ تھا، سلطان نے اس پورے علاقہ میں علماء، صوفیہ، اور مذہبی معلمین کی قطار در قطار آبادی کردی، مؤذن، خطیب، امام اور ملا، (جو جانور شرعی طور سے ذبح کرتے تھے) موروثی مقرر کردیئے، اور ان سب کے لئے وظائف اور سرکاری اوقاف معین کئے، جو آج تک ان کے اخلاف کے قبضہ میں ہیں، وہاں کے دیہاتوں میں آج تک انھیں ملاؤں کی اولاد اپنے اس فرض کو ادا کر رہی ہے، یہانتک کہ کوئی ہندو بھی اگر جانور ذبح کرانا چاہتا ہے، تو یہ خون انھیں کے ہاتھوں سے کراتا ہے، یہاں اب بھی ایسے سینکڑوں ہزاروں شریف خاندان آباد ہیں، جو انھیں مذہبی فرائض کے لئے یہاں آباد کئے گئے تھے، اور ان کو اس کے لئے سرکاری اوقاف دیئے گئے، جن پر وہ آج تک قابض ہیں اور انھیں کے بدولت آج انگریزی سرکار میں بھی ان کو عزت اور وقار حاصل ہے، اور مسلمانوں کی کچھ ممتاز صورتیں وہاں نظر آتی ہیں،

بھڑوچ

بھڑوچ جس کے کنارے دریائے نربدا بہتا ہے، اور جو آگے چل کر بحر عرب میں مل جاتا ہے، عربوں کے جنگی وتجارتی آمد و رفت کا مرکز تھا، عرب اس کو بروص کہتے ہیں، سنہ ۱۴ھ میں حضرت عثمان ذوالنورین کے عہد میں جب اسلام کے ملکی فتوحات کا شباب تھا، ان کے جنگی جہاز اس کے ساحل پر آکر لگے تھے، سفر کے اثناء میں جب میں بھڑوچ پہنچا اور نربدا کے کنارے آکر کھڑا ہوا تو تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو چھتیس برس پہلے کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کردیں، اور گو میں شاعر نہیں، تاہم جذبات کے تلاطم نے موزوں ترانہ کی شکل اختیار کرلی،

نربدا اے نربدا! اے جادۂ بحر عرب — گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحر عرب

جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز — تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز

تو گذشتہ کاروانوں کا نشانِ راہ ہے — ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے

رشتۂ ہند وعرب تجھ سے ہوا تھا استوار — تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہے اسکی یادگار

ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو — چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو

آج کس کو یاد ہے وہ داستانِ باستاں — تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کارواں

تو ہے دریائی پری یا شاہدِ عالم ہے تو — اس سمندر کے گلے کی شہ رگِ اعظم ہے تو

تیرا ہر قطرہ حیاتِ نو کا اک سرشار جام — اس تنِ آبی میں تیرا خون دوڑانا ہو کام

اے بھڑوچ! اے خاتمِ انگشتِ رودِ نربدا — عہدِ ماضی کی تری عزت رہے باقی سدا

توتیائے چشمِ ظاہر آج تیری خاک ہے — ذرہ ذرہ پر تو خورشیدِ ذی لولاک ہے

یادگارِ عہدِ خیر القرن ہے تیری زمیں — مطلعِ انوارِ ذی النورین ہے تیری جبیں

چشمِ عبرت کی نگاہیں جب تری جانب اٹھیں — تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطریں بن گئیں

یہ ترانہ تال سر اور زیر و بم سے خالی ہے، اس لئے اہلِ وجد و سماع اس پر کان نہ دھریں،

بھڑوچ کا ایک پرانا خاندان

بھڑوچ میں عہد عالمگیری کی یادگار ایک خاندان ہے جو یہاں مسند قضا پر متمکن تھا، اس خاندان کے موجودہ چشم و چراغ جناب قاضی نور الدین شیرازی صاحب ہیں، لبِ دریا ان کا فضیلت کدہ یادگارِ زمانہ ہے، ایک موروثی کتب خانہ ان کے اسبابِ زینت میں ہے، افسوس ہے کہ اس وقت قاضی صاحب موجود نہ تھے، اس لئے میں خود کتب خانہ کی سیر نہ کرسکا، مگر میرے ایک عزیز نے ان کا کتب خانہ دیکھا ہے، اس کے حسب ذیل چند نوادر کا حال مجھ سے بیان کیا،

اس خاندان کے چند نوادر کتب

(۱) شرح مثنوی مولانا روم (؟) جلد پنجم، آخر میں ہے،

"ذوالقعدہ سنہ ۱۰۹۰ھ میں بسنت رائے نے قصبہ مچھرٹہ سرکار خیرآباد میں تحریر کیا"

(۲) حدائق السحر فی دقائق الشعر، مولفہ محمد بن محمد بن عبد الجلیل العمری المعروف برشید وطواط

آخر میں ہے :-

تم الکتاب بعون الملک الوہاب وحسن توفیقہ علی ید العبد الضعیف

محمد الحافظ البصروی، تحریراً فی یوم الاثنین، ثانی عشر من ربیع الاول

سنۃ اثنین وستین وثمانمائۃ الہجریۃ النبویۃ بدار السلطنۃ شیراز بزبان تین

(۳) المحیط للسرخسی، جلد ثانی، جمع الامام الہمام مولانا رضی الدین محمد بن محمد بن محمد سرخسی الحنفی، آخر میں ہے:

کان الفراغ من کتابتہ فی یوم الرابع ذوالقعدۃ سنۃ ۹۰۹ھ، کاتب علی بن علی

بن رمضان العبادی الشافعی الازہری،

(۴) گلستان، متوسط تقطیع اور معمولی خط نسخ،

مصنف کے اصل نسخہ سے یاقوت مستعصمی نے اور اس نسخہ سے بحکم جہانگیر سید جلال الدین بخاری نے

اور اس سے سید محمد بن سید زین العابدین، بن سید احمد حسن رضوی نے سنۃ ۱۲۱۹ھ میں نقل کیا،

(۵) مخازن المعروف جلد ثانی شرح مشکوۃ فارسی، از کتاب الزکوۃ، تا کتاب البیوع، دوسری

تیسری اور چوتھی جلد ہے،

صفحہ اول مطلا ہے، تقطیع کلاں، اس پر خواص خاں غلام فرخ سیر بادشاہ غازی کی مہر سنۃ ۱۱۲۵ھ

الو معروف حسین سنۃ ۱۱۱۲ھ بھی تحریر ہے،

مدرسہ دار الارشاد احمد آباد میں بھی رہ چکی ہے،

(۶) کتاب الخلاصہ (خلاصۃ الفتاوی) مؤلفہ طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری، ناقص از وسط

تقطیع کلاں، مختلف مسخ شدہ مہریں ہیں، آخر میں ہے،

تم کتاب الخلاصۃ من املاء الشیخ محمد بن محمد بن نصر المدعو بحافظ

البخاری علی ید افقر عبیدہ محمد المدعو صفی الدین بن محمد الخلیلی

ولد ابن حسین بن علی بن محمد بن احمد، فی دولۃ الملک محمد بن

مراد ابن سلیم بن سلیمان، بن سلیم بن بایزید، من شہور سنۃ ثلاث

بعد الالف سنۃ ۱۰۰۳ھ نقل من نسخۃ تاریخہا یوم الجمعۃ العشرین من شہر

ربیع الاول سنۃ ثلاث وتسعین وستمائۃ ۶۹۳ھ

(۷) مجمع البحرین ترجمہ "اپنکھت پرم ہنس" از اتھربن وید، فارسی، شاہ سرمد نے سنۃ ۱۱۳۶

ہی سنسکرت سے ترجمہ کیا، کاتب نند رام ولد انت رام خط فارسی نستعلیق، ۱۳×۸ تقطیع صفحات ۸۲،

ہندوستان کی سب سے پرانی مسجدیں

قاضی صاحب کے عزیز خاص جن کو حکومت برطانیہ سے سردار صاحب کا خطاب حاصل ہے، وہ موجود تھے، ان کا دولتکدہ بھی گذشتہ جاہ وجلال کا کہنہ مرقع تھا، موصوف نے اپنے خاندان کے پرانے ہتھیاروں کی سیر کرائی، ان کی عمارت کے سلسلہ میں ایک چھوٹی سی معمولی مسجد ہے جس پر سنۃ ۴۳۰ھ کا یہ کتبہ لگا ہے، "ہذہ العمارۃ القدیمۃ فی شہور سنۃ ۴۳۰" اس کتبہ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ بعد کو لگایا گیا ہے، بہر حال اس کی کوئی تاریخی سند اگر موجود ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس صوبہ کے اسلامی فتوحات سے پہلے کی یادگار ہے، یا یوں کہئے کہ محمود غزنوی کے حملۂ گجرات سے چند سال بعد کی ہے جو بہر حال کوئی مستقل فتح نہ تھی،

اس کے بعد اس شہر میں اسلام کی ایک اور قدیم یادگار وہاں کی سنگی جامع مسجد ہے، اس جامع مسجد کی اصل تعمیر کا کتبہ سنۃ ۴۵۵ھ ہے، بعد کو محمد تغلق کے عہد میں سنۃ ۷۲۱ھ میں دروازہ کے اوپر ایک گنبد کا اضافہ کیا گیا ہے، یہ گنبد سنگ خارا سے بنایا گیا ہے، اور اس پر حسب ذیل کتبہ لگا ہے،

"درعہد دولت سلطان عالم غیاث الدین والدنیا محمد تغلق، ہفتصد وبست ویک"

غالباً ان مسجدوں سے زیادہ پرانی کوئی دوسری مسجد ہندوستان میں نہ ہوگی،

الکلشور کا ایک خاندان

بھڑوچ سے قریب ہی ایک پرانا قصبہ الکلشور نام ہے، جو سورت کے سفر میں کبھی

بیچ کی ایک منزل تھا، یہاں بھی عہد شاہی کی یادگار، ایک خاندان آباد ہے، خاندان کے بانی شاہ عبدالعلیم صاحب ہیں، جو اکبر کے معاصر تھے، ۱۰۰۵ھ میں انھوں نے وفات پائی ہے، ان کی خانقاہ و مسجد یہیں ہے، خاندان کے موجودہ جانشین کا نام سید حیدر علی غلام علی انعامدار ہے، موصوف کے پاس خاندان کی پرانی آبرو کی سند پرانی کتابوں کی ایک الماری ہے، اس میں چند عربی کی اور باقی فارسی تصوف کی کتابیں ہیں، گجراتی اردو میں بھی بعض کتابیں نظر آئیں،

اس خاندان کے چند نوادر کتب، عربی کتابوں میں سب سے نادر چیز یہاں قدیم طب کی ایک کتاب تقویم الادویہ ہے، اس کا سال کتابت ۵۸۵ھ ہے، نسخہ بخط عرب شیرۂ خرما سے لکھا ہوا ہے، اور اب تک اچھی حالت میں ہے،

حقہ کی تاریخ یہاں ایک مجموعہ میں ایک صفحہ پر چند واقعات کی تاریخیں لکھی ہوئی نظر پڑیں، جن میں سب سے اہم ہندوستان میں حقّہ کے رواج کی تاریخ ہے، یہ تاریخ "ناخوشی نبی" کے الفاظ سے نکالی گئی، جس سے ۱۰۲۹ھ نکلتے ہیں، چونکہ یہ چیز گجرات ہی کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے، اس لئے عجب نہیں کہ تاریخی بیان صحیح ہو، ۱۰۲۹ھ جہانگیر کا عہد ہے،

بنائے سورت کی تاریخ گجرات کا دوسرا مشہور دریا جو بحرِ عرب سے جا کر ملتا ہے، دریائے تاپتی ہے، اس کے ایک کنارہ پر شہر سورت آباد ہے اور دوسرے کنارہ پر راندھیر، پہلے بحرِ عرب میں جانے والے جہازوں کا بندرگاہ راندھیر تھا، مغلوں کے شروع عہد میں اس کے بجائے سورت کی آبادی بڑھی اور وہ ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ بنا، اس قلمی یادداشت میں اس بندرگاہ کی آبادی کی تاریخ ۹۳۷ھ نظر آئی، تاریخ کا مصرع یہ تھا، ع

بادآباد بندرِ سورت،

راندھیر جس کو پہلے رانیر کہتے تھے، اسلام کے قدیم فتوحات میں ہے، اس یادداشت میں اس فتح کی تاریخ ایک قدیم مسجد کے کتبے سے حسب ذیل بتائی گئی تھی،

بنا کرد مسجد بجائے کنشت   برایوانش انّا فتحنا نوشت
۹۱۵ھ

راندھیر کی پرانی مسجد چند دوستوں کی دعوت پر راندھیر جانے کا بھی اتفاق ہوا، یہ دولتمند دیندار مسلمان تاجروں کا مسکن ہے، اور دعویٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس قصبہ میں جس قدر خوبصورت، اور عمدہ اہتمام کے ساتھ مسجدیں دیکھنے میں آئیں پورے ہندوستان میں کہیں نہیں آئیں، ان مسجدوں میں سے ایک قدیم مسجد چونادوارہ ہے، یادداشت مذکور میں اس مسجد کی بنا کی تاریخ یہ لکھی تھی،

گر کسے پرسد ز تو نافع ازیں معبد شریف

گو مسمّٰی مسجدِ اعلیٰ و درباب شریف
۹۶۵ھ

گجراتی ہندوی کی بعض کتابیں بھی اس خاندان کے ذخیرہ میں دکھائی دیں، جن میں سے درج ذیل کتابیں ذکر کے قابل ہیں،

لغت عربی و ہندی عربی اور ہندی یا ہندوستانی کا ایک لغت ملا، جس کے شروع کے چند شعر یہ ہیں،

الله خدا ہے کرتار	الخالق آفریہ سرجنہار
الدنیا کہتی سنسار	الاحمق نادان گنوار
الجنت بہشت سرگ	السقر دوزخ مرگ
الیوم روز دیس	الشعر موئی کیس
اللیل شب رات	القول گفت بات
السبیل راہ باٹ	السبع ہفت سات
الاسم نام ناؤں	الموضع دیہہ گاؤں
الظل سایہ چھاؤں	المقام جائیگہ ٹھاؤں
الراس سر سیس	العشرین بست بیس

العین چشم آنکھ   اللحیہ ریش پانکھ

الاذن گوش کان   الورق برگ پان

الطعام خوردن کھان   السھم تیر بان

آخری حصہ:-

الفرح خوشی بلاس   القنوط ناامید نراس

الفخذ ران تھی جانگ   الجسم تن ہے آنگ

المورد آب خورا درارہا   السمر افسانہ پواڑا

الکدر تیرہ گدلا   النقیم نابینا اندلا

مصنف اور تصنیف کا زمانہ مذکور نہ تھا،

اسی قسم کا ایک عربی لغت برادر عزیز سید نجیب اشرف صاحب ندوی کی ملکیت میں ہے، مگر وہ اس کے علاوہ ہے، اس کے ابتدائی شعر یہ ہیں،

الالہ پرستیدہ پوجیا   المعلوم دانستہ بوجھیا

المحمد ستودہ بکھانیا   المعروف شناختہ پچھانیا

الرسول فرستادہ بھجیا   الواضح روشن سنجیا

الآل دودمان کنبہ   العنقود خوشہ لونیا

معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ گجرات میں عرب اور ایرانی کثرت سے آیا کرتے تھے، اس لئے ان کو ہندی سے آشنا کرنے کے لئے اس قسم کے لغت یہاں لکھے گئے ہیں،

رسالہ فقیری چار پیر چودہ خانوادہ — اس رسالہ کا آغاز ان لفظوں سے ہے،

"بدانکہ بوجھ توں یہ رسالہ فقیری حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا ہے، باید پڑھے دیکھے وگرنہ تو فقیری نہ کرے،

سوال - اگر تیرے پوچھے کہ اول فقیری کیا ہے و آخر فقیری کیا ہے، اور خانہ یعنی گھر فقیری کیا ہے، اور کیلی فقیری کیا ہے، اور لقمہ فقیری کیا ہے،

اسی قسم کے سوال و جواب پر رسالہ کے اکیس صفحے ختم ہوئے ہیں، تصنیف و مصنف کے ذکر سے پوری خاموشی ہے،

رسالہ فقہ ہندی — یہ فقہی مسئلوں کے بیان میں ایک نظم ہے، آغاز کے اشعار یہ ہیں،

حمد و ثنا سب رب کوں خالق کل جہان   لائق حمد ثنا ہی کے اور نکو نہ جان

علم شریعت نال دی بھیجا پاک رسول   جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول

یارب اپنے کرم سوں بیحد بھیج درود   نبی محمد مصطفےٰ تسوں ہوں خوشنود

بھیجو اُن کی آل پر اور اصحاب تمام   تس پیچھو احباب پر بہت درود سلام

کیتنے مسئلے دین کے عبدر کھے امین   فقہ ہندی زبان سے بوجھ کرو یقین

مطلب مسئلے پوچھنا، جو کچھ ہوئے زبان   عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

اس کے بعد فقہی ابواب ہیں اور ان کے تحت میں ہر قسم کے مسائل ہیں، خاتمہ میں تصنیف کا سال سنہ ۱۰۷۵ھ بعہد اورنگزیب عالمگیر صاف بتایا گیا ہے، خاتمہ میں ہے،

فقہ ہندی کوں مومناں کرو زبان پر یاد   مسائل آویں دین کے کبھو نہ ہوے فساد

سنہ ہزار پچھتر پیچھے ماہ رمضان تمام   اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اس فقہی نظم میں خاص چیز نظم کا وزن ہے، جو عربی و فارسی کے بجائے ہندی وزن کی پیروی میں ہے، اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پرانے لوگوں کے زمانہ میں ہندی کس کو کہتے تھے،

داستان حضرت ماہ رمضان — اس نظم میں ماہ رمضان کی فضیلتوں کا ذکر ہے، مصنف کا نام بدیع الدین ہے، شروع کے شعر حسب ذیل ہیں:-

سرنامہ از نام سبحان لکھوں — کہ دل کی ورق پر سبجی کر رکھوں

زباں کو ہے جوہر اسی کی ثنا — اسی کی سو قدرت ہر جگ میں عیاں

کریم و رحیم و وہ غفار ہے — کرم عاصیاں پر کرنہار ہے

ز ہر چیز اس کی صنعت کا بیاں — کہ پیدا کیا جن نے ارض و سما

آخر میں لکھا ہے،

کرو اس کی سب نعمتوں پر شکر — مصیبت کے اوپر حکم ہر صبر

کہ تا عاقبت تیری ہووے بھلی — کہ شادی و غم جگ میں جائے چلی

بدیع الدین تعریف عمل کی کرو — کہ چھونک کی جس ہیں توقع دھرو

اس نظم کی خصوصیتِ خاص فارسی آمیز ترکیبیں، اور قافیوں میں صرف صوتی ہمرنگی ہے، عربی الفاظ حکم اور صبر وغیرہ کو اس طرح باندھا ہے، جس طرح ہندی میں بولے جاتے ہیں،

داستانِ قیامت | اس نظم کا شروع ان اشعار سے ہے،

سخن ہے مرا جوں گلِ بوستاں — نصیحت کی باتاں سنو دوستاں

لباسی مسلمان کماتے ہیں دوست — کہ کھاتے ہیں سب گائے بکری کا گوشت

لباسِ شریعت کریں تن منیں — شریعت کی باتاں نہ کچھ من منیں

بڑی ریش تسبیح خوش پیرہن — بھری دل میں کئیں بھات کے مکرو فن

آخری شعر میں اس نظم کا سال ۱۰۷۷ھ (؟) بتایا گیا ہے،

سنہ ایک ہزار و ستو ترنے سو — لکھی ہے حکایت کتابوں کی رو

بتاریخ غرہ دریں ماہ پیر — باتمام آں شد، مدد دستگیر

فقہ مبین | یہ نظم فقہ کے مسائل میں ہے، آغاز اس طرح ہوتا ہے،

بنامِ پاک رب العلمین سوں — شروع کرتا ہوں میں فقہ مبیں سوں

بحقِ مفخر و مقبول مرسل — سبھی عقدہ فقہ کے مجھ پہ کر حل

مسائل فقہ کے ہیں اصلِ ایماں — جو نیں بوجے سو وہ کیوں ہوئے مسلماں

اس کے بعد اپنے تمام ۴۰ ماخذوں کا نظم میں ذکر کیا ہے، پہلے ایمان کے مسائل، پھر طہارت وضو، غسل وغیرہ اس کے آخر میں بدعت کا رد اور جوے کی برائی ہے، آخر میں ہے،

یقیں فقہ المبیں کوں کرتے مختوم — بحقِ دیں پناہ و آلِ معصوم

صد و ہشتاد و دو و الف ہجرۃ — بتاریخ ہمایوں گشت تمت

اگھیارا سو میں اسی اوپر دو — سنہ ہجری نبیوں کے بتا یو

رسالہ کے آخر میں خاتمہ کی عبارت ہے،

"نسخہ قوت دین فقہ المبین تصنیف حضرت شاہ یقین رحمۃ اللہ علیہ"

اس سے مصنف کا نام شاہ یقین، کتاب کا نام قوت دین فقہ المبین، اور تصنیف کا سال ۱۱۸۲ھ معلوم ہوتا ہے،

مثنوی کتخدائی | کسی رسم شادی کی تعریف و توصیف میں ہے، رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

ثنا و حمد ہر درگاہِ یزداں — وو خالق سب کا ہے کیا جن و انساں

ثنا و حمد کے لائق سدا ہر — سزاوار او خدائی کا خدا ہے

. . . .

محمد اشرفِ اولادِ آدم — حبیب و سرور و سردارِ عالم

شہِ آدم محمد سرورِ دیں — کہ ختم الانبیاء ہیں رہبرِ دیں

ہوا جس شان میں لولاک وارد — دیکھو محبوب کا رتبہ ہے شاہد

اس کے بعد خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی مدح اور امامین علیہما السلام کی تعریف میں چند شعر

ہیں، اس کے بعد نکاح کا قصہ شروع ہوتا ہے،

شروع کرتا ہوں اب شادی کی تعریف   نزاکت سیں لکھوں میں اس کی توصیف
مہیا سب کیا سامانِ اظہر   لباس و زیور و لولو و گوہر

اس کے بعد ان سرخیوں کے ماتحت چند باب ہیں: در وصفِ الطعام، در وصفِ المحل، در وصفِ بردن برات، در وصفِ شہرگشت، در وصفِ نکاح خوانی، در بیانِ خلوت، خاتمہ اس پر ہے:

سخن کو مختصر کاں تک لکھے گا   یہ ہے طومار آخر کوں تھکے گا
بعشرت عیش با دا سانہ واری   مری یو مثنوی ہے یادگاری
شب بست و دوم از ماہ رجب   کہ شادی ہور شہر گشت ہے شب
سنہ ہجری دراں وقت بود موجود   ہزار و یکصد و تسعین و یک بود

آخر شعر سے تصنیف کا سال ۱۱۹۱ھ معلوم ہوتا ہے وزن سے حرفوں کا گرنا، اس وقت معیوب نہ ہوگا

وفات نامہ حضرت نبیؐ | آغاز:-

ثنا اول کروں حمدِ خدا میں   زباں اوپر اپس کی ابتدا میں
کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت   بنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت

بیچ کا ایک شعر ہے، جس میں زبان کا نام دکھنی بتایا گیا ہے،

مجھے توفیق دے یارب کہ بولوں   بنا ہجر نبی دکھنی میں کھولوں

تصنیف کا سال معلوم نہیں، کتابت کا سال ۱۲۵۱ھ ہجری ہے،

قصہ بانو | اس مثنوی میں ایک قصہ بیان ہوا ہے، جس کے متعلق شاعر کا دعویٰ ہے کہ یہ قصہ پہلے فارسی میں تھا، اور اب دکھنی میں اس کو نظم کیا جاتا ہے،

عزیزاں روایت سنو کان دھر   اول فارسی تھی یہ دکھنی دگر

اتھا گوڑہ ایک شہر کا جو نام   ہمیشہ فتح کا اتھا واں مقام
بیٹھے ایک دن اس جمعہ مسجد منے   اتھے خرد و بزرگ او سارے جنے
وتے میں مسافر نیا آن کر   سلام علیک کہہ کے بیٹھا اگر
پوچھے سب نے اسکوں توں کاں ستے آیا   شہر ہے دور ہے نام محمد حیا
لگا بولنے کوں اوپوں ٹک بات   زلیخا کا قصہ اونوں کے سنگات
مگر ساری مجلس نے سنکر کلام   لگے بولنے آفریں سب تمام

فتح شاعر کا تخلص ہے، آخر میں ہے،

فتح مختصر کر تو اپنی زباں   کہاں تک تو لکھے گا اس کا بیاں

زمانہ معلوم نہیں، تاہم اس کے بعض الفاظ خاص لحاظ کے قابل ہیں: "تھا" اور "تھے" کی جگہ "اتھا" اور "اتھے" اور "کی" کی جگہ "او" "میں" کی جگہ "منے"، "کہاں" کی جگہ "کاں"، "وہ" کی جگہ "او"۔

قصہ سوداگر عجم | یہ نظم حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت کے بیان میں ہے،

آغاز اس طرح ہے:-

ثنا اور حمد مولا کی صبح و شام کرتا ہوں   درود اں مصطفیٰ اوپر دل و جاں سیں پڑھتا ہوں
درود اں حمد کے پیچھوں حکایت اک کہوں نادر   عزیزاں تم سنوں اسکوں کہو دل کوں تمیں حاضر

آخر میں تاریخ ہے،

اگھیار سو اور چھپن برس گذرے تھے ہجرت کے ۱۱۵۶ھ   تبھی تصنیف میں لائے خوارق پیر حضرت کے
توجہ رحمۃ اللہ پر کرو تم اے شہ پیراں   صفائی باطنی ہووے اسے لے حضرت پیراں

خالق باری | ہمارے فارسی و ہندی ادبیات میں خالق باری کی تاریخ ایک معما ہے، اس کی تصنیف کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشہور ہے، لیکن محققین کو ہمیشہ سے اس میں شک ہے، تعجب کی بات ہے

کہ اس کا کوئی قدیم نسخہ اب تک نہیں ملا ہے، اس کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ نظر آیا، لیکن وہ بھی قدیم نہیں رسالہ تاریخ سے گو معرا ہے، مگر اس کے نستعلیق خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سوا سو برس سے زیادہ عمر کا نہیں

خالق باری کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں ایک لفظ ملتا ہے جو "بدا" یا "بُرا" پڑھا جاتا ہے،

ع واحد ایک، بڑا کرتار، مسلم یونیورسٹی کے سلسلۂ تصنیفاتِ خسرو میں جو نسخہ چھپا ہے، اس میں یہ لفظ "بدا" چھاپا گیا ہے، اور اس کے نیچے "ع" لکھا گیا ہے، لیکن عربی میں "بدا" کرتار کے معنی میں میرے پڑھنے میں نہیں آیا ہے، معلوم نہیں فاضل محشی کے پاس جو عربی اور سنسکرت دونوں کے فاضل ہیں، اس کی سند کیا ہے، موجودہ نسخہ میں یہ لفظ بڑا لکھا گیا، لیکن یہ بھی مہمل ہے، بعض مطبوعہ نسخوں میں "خدا" چھپا ہے اور شاید یہی صحیح ہو،

زیر بیان نسخہ میں اوّل تو کچھ اشعار زیادہ معلوم ہوئے، دوسرے یہ کہ افعال اور ضمائر میں قدامت زبان کی جھلک دکھائی دی، یہ تین شعر نئے معلوم ہوئے جو مطبوعہ نسخہ میں مجھے نہیں ملے،

چوں بہ پرسی خسر بورہ کیست، جو کا بھائی ہے   در خسر پرسی جو کا باپ جن دی جائی ہے

ریخت اندر گوش خود سیماب وی بورا بھیا   پنبہ پیچک روئی گالا، جسم تن آمد - کیا (کذا)

داں نہالی بستر و بالیں تکیہ اے جواں   غلط بالا - لیٹ اوپر - اُس بچھاؤ گستر آں

حسب ذیل شعر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے قلمی نسخہ سے مطبوعہ کے تتمہ ۱۸۴۲ء میں اس طرح چھپا ہے

عطسہ چھینک شاخ سینگ کفش گرہ کفش دوز   گازر و خیاط ہے دھوبی و درزی جامہ دوز

پہلے مصرع کا وزن صحیح نہیں معلوم ہوتا، فاعلاتن کا دوسرا اور تیسرا رکن کم ہے، پیش نظر نسخہ میں یہ غلطی نہیں ہے، پھر دوسرے مصرع میں قافیہ دوز مکرر ہے، جو درست بھی نہیں، اور جامہ دوز تو خیاط اور درزی کے تقابل کے بعد بے معنی سا ہے، پیش نظر نسخہ میں یہ شعر یوں ہے،

عطسہ چھینک و شاخ سینگ و کفش گر ہو کفش دوز   گازر و خیاط ہر دھوبی و درزی، دیس روز

اسی کے بعد تتمۂ نسخۂ مطبوعہ ۱۸۰۵ء میں ہے،

وانکہ بے بخت ست ابھاگ بخت بھاگ   فارسی آمد سرود و ہندوی گو ہند راگ

اس کا پہلا مصرع شروع میں غلط ہے، دوسرا رکن ٹوٹتا ہے، اور تیسرا رکن غائب ہے، چار بار فاعلاتن کے بجائے تین ہی بار ہے، پیش نظر نسخہ میں یہ غلطیاں نہیں،

واں کہ بدبخت است ابھاگا، بخت در فرس ست گ ابھاگ   فارسی آمد سرود و ہندوی گو ہند راگ

مطبوعہ نسخہ میں ہے ع طُعم سواد، و طعام خورش، جو کہئے کھا، پیش نظر نسخہ میں طُعم کی جگہ "مزہ" ہے جو زیادہ بامزہ ہے، مطبوعہ میں ہے،

دُرّ و مروارید موتی جانئے   ہم صدف سیپی، سمندر آنئے

پیش نظر قلمی میں دوسرا مصرع یوں ہے ع ہم تُبد رانی گلے پہچانئے، اس قسم کے اختلافات اور بھی ملیں گے، لیکن اہم چیز ضمیر کا معاملہ ہے، مطبوعہ نسخوں میں لوگوں نے زمانۂ مابعد کی ضمیریں کر دی ہیں، مثلاً قدیم "توں" کی جگہ جدید "تو" بہت پرانی زبان میں متکلم "ہوں" تھا جو اب بھی ہونا سے واحد متکلم کا صیغہ ہے، حضرت خواجہ فرید شکر گنج ۵۶۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۶۴ھ میں وفات پائی اور امیر خسرو نے جنکی طرف یہ خالق باری منسوب ہے ۷۲۵ھ میں وفات پائی ہے، غرض دونوں کا زمانہ کچھ ہی آگے پیچھے ہے، حضرت خواجہ گنج شکر کا جو فقرہ میں نے اپنے مضمون "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے شائع کیا ہے اس میں واحد متکلم اور واحد مخاطب کی ضمیریں "ہوں" اور "توں" استعمال ہوئی ہیں، بعینہ یہی دونوں ضمیریں پیش نظر نسخہ میں ہیں مثلاً

خواہم گفت کہونگا ہوں   خواہم کرد کرونگا ہوں   خواہی آمد آویگا توں   خواہی نشست بیٹھیگا توں

خواہم دید دیکھونگا ہوں   خواہی دید دیکھیگا توں   خواہم داد دیونگا ہوں   خواہی داد دیویگا توں

خواہم دوید دوڑیگا ہوں   خواہی دوید دوڑیگا توں

مطبوعہ نسخہ میں "ہوں" کی جگہ "میں" اور "توں" کی جگہ "تین" ہے،

سفر گجرات کی کچھ اور باتیں بھی بیان کرنی تھیں، مگر دیکھتا ہوں کہ یہ قلمی سفر بھی خاصہ طویل ہو گیا ہے، ہمسفر ناظرین کے ملال کا اندیشہ ہے، اس لئے قلم کی باگ یہیں روک لی جاتی ہے،

دیوان شمس تبریز اور مولانائے روم

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ فارسی نظام کالج حیدرآباد دکن

(۹)

بجز در عشق مطلق جاں نیاریم — فسونہائے خرد را ما نخوانیم

عقل و عشق کا مقابلہ حقیقت شناسی اور یافت حق کے دو راستے ہیں ایک عقلی راہ ہے، اور ایک ایمانی راہ ہے مصرعہ

مومن از عشق است و عشق از مومن است

پہلی راہ فلسفہ ہے اور دوسری مذہب،

مذہب کی بنیاد چونکہ غیبی حقائق پر ہے، اس لئے فلسفہ یا عقل کی راہ اس منزل تک نہیں پہنچ سکتی اس لئے کہ عقل حواس کے تابع ہے اور حواس عالم شہود کے سوا غیر شہود عالم کا علم حاصل نہیں کر سکتے، اور بظاہر ہمارے علم کے ذرائع حواس ہی ہیں، یافت اور معرفت کی ان دو راہوں میں ایک کا سرمایہ قیل و قال اور شک ہے اور دوسری راہ کا سرمایہ یقین "عین الیقین" اور "حق الیقین"، موز بیخودی میں بڑی خوبی سے ان کے فرق نوعیت کو ظاہر کیا گیا ہے،

عقل را سرمایہ از بیم و شک است — عشق را عزم و یقیں لاینفک است

عقل محکم از اساس چون و چند — عشق عریاں از لباس چون و چند

عقل در پیچاک اسباب و علل — عشق چوگاں باز میدان عمل

عقل می گوید کہ خود را پیش کن — عشق گوید امتحان خویش کن

مولانا کے کلام میں بھی خاص طور پر ان دو راہوں کا مقابلہ اور موازنہ پایا جاتا ہے، اور مولانا نے اس پر بڑا زور دیا ہے، اسلام میں اعتزال وغیرہ کے عقلیہ فرقے پیدا ہوئے، مولانا نے ان کو فتنۂ عظیم سے تعبیر کیا ہے،

سوے مدرس خرد آید در سوال — کیں فتنۂ عظیم در اسلام شد چرا

اس مقابلہ اور موازنہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

عاقلاں را اندراں غفلت بماں — عاشقاں را چشم معنی بر کشا

از سینہ پاک کردم افکار فلسفی را — در دیدہ جاے کردم اشکال یوسفی را

مثنوی میں ارشاد ہوتا ہے،

عقل جزوی عشق را منکر بود — گرچہ بنماید کہ صاحب سر بود

آفتاب عقل را در سوز دار — چشم را چوں ابر اشک افروز دار

داند آں کو نیک بخت و محرم است — زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

درمیان پردۂ خون عشق را گلزارہا — عاشقاں را با جمال عشق بیچوں کارہا

عقل گوید شش جہت حد است و بیرون راہ نیست — عشق گوید ہست راہ و رفتہ ام من بارہا

عاشقان خستہ دل را در درونہ ذوقہا — عاقلان تیرہ جاں را در درون انکارہا

عقل گوید پا منہ کاندر فنا جز خار نیست — عشق گوید ہست در تو مایۂ آں خارہا

عشق تو چوں در آمد اندیشہ مرد پیشش — عشق تو صبح صادق اندیشہ صبح کاذب

شمع گیتی بود عقل چارہ گر — شمع را پروانہ کردی عاقبت

آتش دریں عالم زنیم ایں چرخ را برہم زنیم — ایں عقل پا برجائے را از عشق سرگرداں کنیم

بجز در عشق مطلق جاں نیاریم — فسونہائے خرد را ما نخوانیم

دل بدست آور کہ حج اکبر است
وز ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است (مثنوی روم)

دل کی عظمت و اہمیت عشق، یقین اور ایمان کا تعلق قلب سے ہے، قرآن مجید میں ابراہیم حنیف کے

کمالِ باطن کی تعریف قرآن کے "قلبِ سلیم" کو نشانِ عظمت ظاہر کیا گیا ہے، حدیث میں ہے، کہ دل ہی انسانی صلاح اور بگاڑ کی کنجی ہے، انسان کی عظمت اس کی قلبی وسعت و کیفیت کی نوعیت پر مبنی ہے، یہ ایک واقعہ ہے کہ انسانی علم و عمل کی طاقت قلبی توجہ پر منحصر ہے، جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا کہ مولانا اس کی اہمیت اور اس کے اعلیٰ مقاصد اور نتائج پر اپنے کلام و پیام میں بیحد زور دیتے ہیں، اس لئے تزکیۂ دل اور تصفیۂ قلب پر بھی بے حد اصرار کرتے ہیں اور اسکی اہمیت کو طرح طرح سے ظاہر کرتے ہیں، تاکہ کثرتِ ذکر اور تکرارِ تجدید سے سامع اس عظیم الشان حقیقت کی طرف متوجہ ہوجائے، مثنوی میں فرماتے ہیں،

کاں جمالِ دل جمالِ باقیست　　دولتش از آبِ حیواں ساقیست

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است　　من نہ گنجم ہیچ در بالا و پست

در دلِ مومن بگنجم اے عجب　　گر مرا جوئی دراں دلہا طلب

مولانا کی یہ معنوی خصوصیت دیوان میں بھی قائم ہے، دل کو منظر گاہِ حق قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں،

در آور دل کہ منظر گاہِ حق است　　اگر ہم نیست منظر می تواں کرد

دل آہن ز شوقش نرم گردد　　دل ار سنگ است جوہر می تواں کرد

دل کا تیر راست ہونا چاہئے،

گر قاب قوس جوئی دل است کن چو تیرے　　در قوسِ او در آید ہر کو چو تیر باشد

دلِ عاشق کی پرواز دکھائی ہے،

یہ مرغِ دل عاشق در دام کجا گنجد　　پرواز چنیں مرغے از کون بروں باشد

آئینۂ قلب میں صفاء ہو تو آفتابِ حقیقت اس میں منعکس ہوگا،

چوں کاہ جفت گل بود آئینہ کے مقبل بود　　چوں کہ جدا گردد ز گل آئینہ گردد با صفا

دل را تو صیقلے کن تا نقشِ او پذیرد　　زاں نقشِ بے جہت ایں شش سو منقش آمد

مثنوی میں بھی یہی ہدایت ہے،

آئینہ کو ز زنگ و آلائش جدا است　　پر شعاعِ نورِ خورشیدِ خدا است

ولایت اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ اہلِ دل کی صحبت اختیار کیجائے،

گر اولیائے حق را از حق جدا شمردہ　　گر ظنِ نیک داری بر اولیا چہ باشد

اہلِ دل کی صحبت سے مقصود تک رسائی ممکن ہے،

دلا نزدِ کسے بنشیں کہ او از دل خبر دارد　　بزیرِ آں درختے رو کہ از گلہائے تر دارد

مثنوی میں بھی اہلِ دل کی صحبت کے فیض کا ذکر جگہ جگہ ہے،

یک زمانہ صحبتے با اولیا　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

دل سے متعلق ایسے اشعار سینکڑوں کی تعداد میں ہیں،

صد آہ شرر ریزے اک شعر دلآویزے　　(رومی)

جذباتِ عشق

شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ جن احساسات اور قلبی حالات اور کیفیات کو بیان کرنا چاہے اس خوبی سے ان کو ادا کرے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے اس حالت کی تصویر کھنچ جائے اور وہ شاعر کے اس احساس میں شریکِ حال ہوجائے، مولانا کے کلام کی اصل خصوصیت یہی ہے، لذتِ دید کی کیفیت بیان کی ہے،

دل پیشِ رخش چہ رقص می کرد　　وز آتشِ عشق جان چہ می شد

"چہ رقص می کرد" اور "جاں چہ می شد" میں لذتِ دید اور بے تابیِ شوق کا نقشہ کھینچ دیا ہے،

عشق میں غم سہتے سہتے عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اسے اس میں لطف آنے لگتا ہے، اس حال میں اس کی نظر درد و غم پر پڑتی ہی نہیں، صرف لطفِ محبت ہی کا خیال رہتا ہے، ہر غم کو مسرت سمجھتا ہے، اور

آسانی سے برداشت کرلیتا ہے، اس حالت کو بیان کرتے ہیں،

منگر رنج و بلا را بنگر عشق و ولا را — غم او لطف لقب کن زغم و درد طرب کن

رندانِ قدح خوار کا کبھی یہ عالم ہوتا ہے کہ جب وہ خوب پی لیتے ہیں تو پھر انھیں پستی اور بلندی کی خبر نہیں رہتی، حالتِ سرور میں رقصاں ہوتے ہیں، مستی کی اس حالت کا نقشہ مولانا نے اس طرح کھینچا ہے،

باز رسیدیم زمیخانہ مست — باز رہیدیم زبالا و پست

جملۂ مستاں خوش و رقصاں شدند — دست زنید اے صنما دست دست

ایک اور شعر ہے،

زشوقت من زتن بیگانہ گردم — شرابِ عشق را پیمانہ گردم

دوسرا مصرع بے خودی اور خود فراموشی کی بہترین تعبیر اور تصویر ہے،

عاشق انتظار میں ہے، دیر بے حد ہوگئی، کچھ مایوسی سی دل پر چھا گئی، لیکن یکایک محبوب دلنواز سامنے آگیا، عاشق کی آنکھیں "بتِ بے وفا" کو دیکھتی ہیں، لیکن دل کو اس خوش نصیبی کا یقین نہیں آتا، پھر بار بار نظر کرنے سے یہ شک رفع ہو جاتا ہے، اور جوشِ مسرت سے عاشق اچھل پڑتا اور پکار اٹھتا ہے،

یار آمد ز در خلوتیان دوست دوست — دیدہ غلط می کند نیست غلط اوست اوست

معشوق پری رخ کو دیکھکر اس کی لطافت و رنگینی کا جو نازک احساس دل میں پیدا ہوتا ہے اس حالت کو الفاظ کے مرقع میں پیش کیا ہے، جس سے آنکھوں کے آگے ایک سماں بندھ جاتا ہے،

روئے تو چو نو بہار دیدم — گل راز تو شرمسار دیدم

دعا مغزِ عبادت ہے، عبدیت کی یہ کیفیت مولانا پر طاری ہوگئی ہے، اور دعا کا یہ عالم ہوگیا ہے کہ جو دیکھتا ہے وہ بھی دعا گوئی ہی کی درخواست کرتا ہے، عجز و عبدیت کی اس حالت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے،

ہمہ دعا شدہ ام من زبس دعا کردن — کہ ہر کہ دید مرا از من او دعا خواہد

عاشقِ خستہ جان مسلسل محبوبِ سنگدل کی بے توجہی کا شکار ہے، اسے خیال ہوتا ہے کہ محبوب ہمیشہ ناز میں ہے وہ ہمارے نیاز کی حالت کو کیا محسوس کریگا، اسے ہماری جگر کاوی اور دلسوزی کا کیا احساس ہوگا، وہ متمنی ہے کہ خدا کرے خود محبوب بھی کسی کو اپنا مطلوب بنائے اور کسی پر جان دے، تاکہ وہ عاشق کے حالِ زار کو محسوس کر سکے، ع کبھی جلوہ گر ہو خدا کرے ترا ناز میرے نیاز میں؛ اس حالت کو اس طرح بیان کرتے ہیں،

اے خداوند یکے یار جفا کارش دہ — دلبرِ عشوہ گر و سرکش و خونخوارش دہ

چند روزے زپئے تجربہ بیمارش کن — با طبیبانِ دغا پیشہ سروکارش دہ

تا بداند کہ شبِ ماہ چساں می گذرد — درد و عشقش دہ و عشقش دہ و بسیارش دہ

کبھی طلب اس قدر شدید ہوتی ہے کہ باوجود کافی سامان ہونے کے دل سیراب نہیں ہوتا اور تشنگی رفع نہیں ہوتی، بے چینی ہنوز باقی رہتی ہے، اس کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے،

شمس تبریزی ہمہ دریائے فضل و رحمت است — لیک جانِ تشنہ زاں دریائے سیراب نیست

ما نورِ خدائیم دریں خانہ فتادہ

(رومی)

ما آبِ حیاتیم دریں جوئے روانیم

شرفِ نفسِ انسانی بنی آدم کی کرامت مسلم ہے، روحانی جماعت انسان کو "آئینۂ ذاتِ حق" سمجھتی ہے ع

ذاتِ ما آئینۂ ذاتِ حق است

لیکن مادہ پرست گروہ بھی بہر حال اس کو سلسلۂ حوادث میں افضل ترین کڑی خیال کرتا ہے، اور کائنات میں مادی ارتقاء کی آخری کڑی انسان ہی قرار دیا گیا ہے، حقیقت کو بے نقاب کرنے والوں کے سردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعلان فرمایا ہے کہ انسان خدائی سانچہ پر ڈھلا ہے، ان اللہ خلق آدم علی صورتہ خود خالقِ عالم کا ارشاد ہے، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم، ولقد کرمنا بنی آدم،

مولانا نے انسان کی عظمت و بزرگی پر اپنے کلام میں بے حد زور دیا ہے، یہ شے مولانا کے کلام کے ان خصوصیات میں ہے جو مولنٰنا کو فارسی کے دیگر غزل گو صوفی شعراء سے ممتاز کرتی ہے، میرا یہ مطلب نہیں کہ اور لوگوں نے انسان کے شرف اور بزرگی کو بیان نہیں کیا، بلکہ یہ مولنٰنا کے خاص مضامین شعری میں سے ہے، اور انھوں نے اس زور اور کثرت سے اس نقطۂ نظر پر بحث کی ہے کہ دوسروں کے کلام میں اسکی نظیر نہیں ملتی، ان کا دیوان انسانی شرف اور تعظیم کا ایک نغمۂ دل افزا ہے، کہیں انسان پر اسکی قدر و قیمت کا اظہار کرتے ہیں، کہیں اس کی عظمت اور بلندی کی تصویر پیش کرتے ہیں، اسے غیرت دلاتے ہیں اور نصیحت کرتے ہیں کہ تو" دولت بے بہا ہے" اپنا اصل محل اور موقف حاصل کر۔ ع

تو گوہری کہ کسے رابکف بہائے تو نیست

یہ صفت مولنٰنا کی معنوی خصوصیات میں سے ایک ہے، انسان کی حقیقت اور عظمت کا بیان ہے

ما نور خدائیم دریں خانہ فتادیم — ما آب حیاتیم دریں جوئے روانیم

ما نور خدائیم دریں خانہ نہانیم — ما مرغ شکر فیم دریں دام نہانیم

ما نور سمائیم ازاں فضل شمائیم — ما شاہ زمینیم و سلیمان زمانیم

"زبور عجم" میں اسی بحر میں ایک مؤثر نظم ہے، جس کا ایک بند یہ ہے،

ناموس ازل را تو امینی تو امینی — دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمینی تو زمانی — صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

مولانا فرماتے ہیں:-

ما مہر سپہر لامکانیم، — برتر ز زمین و آسمانیم

ما برزخ جامعیم و فاضل — نے نے کہ بروں زاین و آنیم

ما محرم بارگاہ انسیم — در جام جہاں چو جانیم

ایک اور غزل کے اشعار ہیں،

ما گوہر کن فکانیم — ما مردم دیدۂ عیانیم

ما شاہد حضرت جلالیم — ما چشم و چراغ انس و جانیم

ما نقطۂ مرکز زمینیم — ما نکتۂ سر آسمانیم

انسان مسجود ملائک ہے،

اوست مسجود ملائک زانکہ بے ہمتاست او — بارگاہ رفعتش بیرون ز چرخ چنبری

مولانا کم فرماتے ہیں کہ انسان کو ذلت کی نگاہ سے مت دیکھو،

وجود قابل انسان چو مظہر حق است — مکرمست بدیں واسطہ مبیں خوارش

اس مضمون پر مثنوی میں بھی بیحد زور دیا گیا ہے،

وجہ آدم آئینہ اسماء کند — عکس خود در صورتش پیدا کند

از رہ صورت نماید غیر دوست — چوں نظر کردی بمعنی جملہ اوست

مولنٰنا کے خیال میں انسان ابد کے لئے بنایا گیا ہے،

طمع مدار کہ عمر ترا کراں باشد — صفات حق و حق را حد و کراں زکجا

انسان کی منزل ذات کبریا ہے،

ما ز فلک برتریم و ز ملک افزوں تریم — زیں دو چرا نگذریم منزل ما کبریاست

اسی پر ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے،

شعلہ درگیر زد برخس و خاشاک من — مرشد رومی کہ گفت منزل ما کبریاست (پیام مشرق)

انسان کی منزل نہایت بلند ہے، اس کو کبھی پستی کی طرف مائل نہ ہونا چاہئے،

نہی بر فرقِ جان تاجے بری دل را بمعراجے چو خورشیدش بر آرائی کہ سبحان الذی اسریٰ

انسان میں بے شمار کمالات چھپے ہوئے ہیں،

دلا زیں تنگ زندانہا رہے داری بمیدانہا مگر خفتست پائے تو تو پنداری نداری پا

بانگِ درا میں ایک شعر ہے جو اس مفہوم کو ادا کرتا ہے،

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

انسان جب اس قدر باعظمت مخلوق ہے تو مولانا کے نزدیک اس کا نصب العین بھی نہایت بلند ہونا چاہئے، اس کی عظمت اس کے مقاصد کی بلندی ہی سے قائم رہ سکتی ہے،

مناقب العارفین میں لکھا ہے، مولانا نے ایک دن انسان کے بلند نصب العین کے متعلق یہ حدیث سنائی، ان اللہ یحب المعالی الامور"

دیوان میں انسانی نصب العین متعین فرماتے ہیں،

ہمائی قافِ قربی اے برادر ہمارا جز ہمائے مصلحت نیست

ز آفتاب و زمہتاب بگذرد نورم چو روئے خود بہ شہنشاہِ دلنواز کنم

عہد حاضر کے پیام بر شاعر اقبال نے انسان کو یہی پیام دیا ہے،

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

مولانا کے نزدیک زندہ دلی کا یہی شعار ہے،

شعارِ زندہ دلاں در طریق گرم رویست اگر فسردہ نہ گرم دار بازارش

مثنوی معنوی میں ایک شعر ہے،

جملہ عالم ہست حاجتمندِ تو تو گدایانہ چہ گردی کو بکو

اسی منشاء اور مفہوم کی ایک غزل دیوان میں ہے، جس میں مولانا کی یہ خصوصیت سخن کامل

طور پر عیاں ہے،

منگر بہر گدائے کہ تو خاص ازان پاکی مفروش خویش ارزاں کہ تو بس گرانبہائی

بعصا شگاف دریا کہ تو موسیِ زمانی بدر آں قبائے مہ را کہ تو نورِ مصطفائی

بخراش دستِ خوباں کہ تو یوسفِ جمالی چو مسیح دم فرو دم کہ تو نیز ازان ہوائی

بصف اندر آئی تنہا کہ سفندیارِ وقتی درِ خیبرست برکن کہ علیِ مرتضائی

بستاں ز دیو خاتم کہ توئی بجاں سلیمان بشکن سپاہ اختر کہ تو آفتاب رائی

چو خلیل رو در آتش کہ تو خالصی و دلکش چو خضر ز آب حیواں کہ تو جوہرِ بقائی

مگسل ز بے اصولاں مشنو فریبِ غولاں تو ز فیضِ ذوالجلالی تو ز پرتوِ خدائی

تو ہنوز ناپدیدی کہ جمالِ خود ندیدی سحرے چو آفتابی ز درونِ خود برآئی

شدۂ غلام صورت بمثالِ بت پرستان تو چو یوسفی ولیکن سوئے خود نظر نداری

بخدا جمالِ خود را چو در آئینہ بہ بینی بتِ خویش ہم تو باشی بکسے گذر نداری

من کان للہ فکان اللہ لہٗ

رنگِ بقا، سر خودی اور رمزِ بے خودی

حضرات صوفیائے کرام کے نزدیک سلوک الی اللہ کی دو حالتیں ہیں، ایک حالت کو فنا فی اللہ اور دوسری کیفیت کو بقا باللہ کہتے ہیں، جب بندہ عبد کامل بنجاتا ہے اور اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں کمالِ عجز کے ساتھ پیش کرتا ہے یعنی

لن تنالوا البر حتی تنفقوا ہرچہ داری صرف کن در راہِ او

پر عمل کرتا ہے تو اسے حالتِ فنا کہتے ہیں، اس منزل میں سالک پر مسکینی، عجز اور شکستگی طاری رہتی ہے، اس نسبت کی طرف اس کی توجہ رہتی ہے،

لیکن جب بندہ فانی بنکر خدائے شکور و غیور کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے، تو ادھر سے کمالات

کی تجلی ہوتی ہے،

چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت   چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

فانی پر بقا کا پرتو پڑتا ہے، اس مرتبہ میں سالک کا حال مختلف ہوتا ہے، اس پر عظمت و جلال کا وہ دبدبہ چھایا ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس نسبت کے آگے دنیاے دوں کی بڑی سے بڑی قوت اور شوکت کو ہیچ سمجھتا ہے، بڑے بڑے صاحبانِ شوکت لرزہ براندام ہوجاتے ہیں، ع

بے نیازی نازہا دارد بسے

جب اس نسبت کا استحکام ہوجائے تو کائنات کی ظاہری اور باطنی قوتیں تابع ہوجاتی ہیں، اسی حالت کو دوسرے الفاظ میں خودی اور بے خودی سے تعبیر کرتے ہیں، اور عالمِ فراق اور حالتِ وصال بھی کہتے ہیں، افلاکی کا بیان ہے کہ

"روزے در تفسیر ایں آیت معنی غریب بیان کرد کہ حق تعالیٰ کل شئی ہالک الا وجہہ فرمودہ است نہ آنست کہ مدح خود می کند و بر بندگانش از قدم بقا تفاخر می آرد کہ من باقیم شما فانی بلکہ دعوت رحمت می کند کہ بکلی در من مستہلک شوید تا در وجہ کریم ما کہ "الا وجہہ" باقی و ابدی شوید،

کل شئی ہالک الا وجہہ   چوں نہٗ در وجہ او ہستی مجو

ہر کہ اندر وجہ او باشد فنا   کل شئی ہالک نبود جزا

زانکہ در الا ست او از لا گذشت   ہر کہ در الا ست او فانی نگشت

مولانا نے کل شئی ہالک الا وجہہ کی یہی تفسیر فرمائی ہے،

بعض سالکانِ راہ پر ایک آن میں دونوں تجلیات ہوتے ہیں، مولانا کا یہی قول ہے،

گہ جانبِ شہرِ بقا گہ جانبِ دشتِ فنا

حضرت شمس کے متعلق فرماتے ہیں،

شمس گر گشت فانی بالذات   در فنا ہا بقاست تا دانی

مولانا پر نسبت بقا کا غلبہ رہتا تھا، چونکہ ان کا کلام ان کے وجدان اور حال کا آئینہ ہے، اسلئے اس میں وہ جلال، بلند آہنگی، زور اور دبدبہ ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ بجلیاں ہیں کہ چمک رہی ہیں، بادل ہیں کہ گرج رہے ہیں اور جھوم جھوم کر برس رہے ہیں، مولانا کی غزلیات کی یہ خاص صفت ہے، یہ کیفیت اس رنگ میں شعرا میں سے کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی، نہ خسرو کی غزل میں یہ رنگ ہے نہ حسن کے کلام میں، نہ بلبل شیراز کے نغموں میں یہ زور ہے، نہ عراقی کے ساز میں یہ بلند آہنگی ہے، نہ سعدی کے بیان کا یہ طرز ہے، مولانا اس خصوص میں سارے صوفی شعرا سے ممتاز ہیں،

یہ انکے کلام کی ایسی خصوصیت ہے کہ خود مولانا نے بہ نفسِ نفیس اس کا اظہار فرمایا ہے،

مناقب میں ہے کہ حضرت مولانا نے سراج الدین تبریزی سے فرمایا کہ

"حکیم الٰہی خواجہ سنائی و خدمت فرید الدین عطار قدس اللہ سرہما، بس بزرگان دین بودند لیکن اغلب سخن از فراق گفتند اما ما ہمہ از وصال گفتیم" (مناقب العارفین ص ۱۴۱)

کلام پڑھ کر اس کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ اس میں لذتِ امروز اور جوشِ فردا دونوں ہیں، زبانِ ربانی رمزِ بقا کا اظہار فرمایا ہے،

چوں خلیل من شدی ز آتش مترس   کہ من از آتش گلستانت کنم

برگلویت تیغہا را دست نیست   گرچو اسمٰعیلؑ قربانت کنم

ان اشعار میں من کان للہ فکان اللہ لہ کی تفسیر فرمائی ہے،

چو جان زار بلا دیدہ با خدا گوید   کہ کس بجز تو ندارم چہ خوش بود بخدا

جوابش آید از آں سو کہ من ترا زیں پیش   بہیچ کس نہ گذارم چہ خوش بود بخدا

عبدیت کی چند روزہ "چاکری" سے باقی رہنے والی شاہی نصیب ہوتی ہے،

دو سہ روز شاہیت را چو شدم بصدق چاکر — بجہاں نماند شاہے کہ او چاکرم نیامد

رہ فنا ہی سے در بقا تک رسائی ہوتی ہے،

خمش کن و بشنو از قائلانِ روحانی — رہ فنا جو بہ بندی در بقا بکشاد

نسبت بقا کا جوش ملاحظہ ہو ع

چو در کفِ سلطاں شدم یک ذرہ بودم کان شدم

نیست کردم ننگِ ہستی را تمام — تا کہ بر زینِ بقا محکم شدم

کاسئہ پُر زہر بودم دست در عیسیٰ زدم — خام دیدم خویش را در پختہ آویختم

چو مہ پئے آفتاب رفتم — گہ کاستم و گہے فزودم

خاموش کہ عاقبت مرا کار — محمود بود چو من ایازم

دولت عشق ہی سے انسان دولت پایندہ اور مردہ سے ابدی زندہ بنتا ہے،

مردہ بدم زندہ شدم گریہ بدم خندہ شدم — دولت عشق آمد و من دولت پایندہ شدم

ز شمس الدین تبریزی نگارا — دمے کو مست شد ہشیار باشد

طبیعت کا جوش اور نسبت بقا کا زور ملاحظہ ہو،

گفتند یافت نیست کہ جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

باز از پستی سوئے بالا شدیم — طالب آں دلبر زیبا شدیم

ما دل اندر راہ جاں انداختیم — غلغلے اندر جہاں انداختیم

مرزا غالب مولانا کے ایک شعر پر جس میں جوش بقا کا اظہار ہے سر دھنا کرتے تھے،

بزیر کنگرہ کبریاش مردانند — فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

گر تو خواہی وطن پر از دلدار

خانہ را رو تہی کن از اغیار (رومی)

توحید

مولانا نے مثنوی میں تصوف کے مسائل اور معارف تفصیل سے بیان کئے ہیں، کیونکہ وہ دور تمکین کی تصنیف ہے، لیکن دیوان میں صوفیانہ مسائل معارف اور علوم کی نہیں بلکہ صوفیانہ جذبات اور احساسات کی پرجوش ترجمانی ہے، تصوف کی بنیاد مسئلہ توحید پر ہے، صوفی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ہر طرح ایک کا ہو رہے، توحید کے معنی یہی ہیں کہ انسان ماسوائے اللہ سے آزاد ہو جائے سوائے حق کے نہ کوئی اسکا معبود ہو نہ مقصود ہو، موجود[1] ہو نہ مشہود ہو،

ہر کہ پیماں با ہو الموجود بست — گردنش از بند ہر معبود رست

اس کی زندگی اور موت صلوٰۃ و قربانی صرف ذات واحد کے لئے ہو، باطنی ترقی اور مذہب کا نصب العین یہی ہے، زندگی کے اسی رنگ کو صبغۃ اللہ کہتے ہیں، قُلْ اِنَّ صَلوٰتی ونُسکی ومحیای ومماتی للّٰہِ ربّ العٰلمین، ابراہیم اسی توحیدی مسلک کے باعث "حنیف" کہلاتے ہیں، سارے روحانی امراض اور اخلاقی خبائث کا واحد علاج توحید ہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی مسلک کی پیروی اور تکمیل کا منصب عطا ہوا،

اہل حق را رمز توحید از براست — در اتی الرحمٰن عبداً مضمر است

دیں از و حکمت از و آئیں از و — زور از و قوت از و تمکیں از و

عالماں را جلوہ اش حیرت دہد — عاشقاں را بر عمل قدرت دہد

ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ — سازِ ما را پردہ گرداں لا الٰہ

[1] اس کا یہ مطلب نہیں کہ مخلوق (محسوسات) کی نفی قطعی کی جائے، بلکہ یہ کہ سوائے حق تعالیٰ کے کوئی وجود ذاتی خارجی نہیں رکھتا، ساری مخلوق صور علمیہ الٰہیہ ہیں اور غیر حق ہیں، اور وہ موجود و موجود حق ہوئے ہیں ھو الاول والاٰخر والظاھر والباطن وھو بکل شیٔ علیم،

لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

ما مسلمانیم و اولادِ خلیل از "ابیکم" گیر اگر خواہی دلیل

تیر خوش پیکانِ یک کیشیم ما یک نما یک بیں، یک اندیشیم ما

(رموزِ بیخودی)

مثنوی معنوی میں مسائلِ تصوّف کی روحِ اعظم یہی مسئلہ ہے،

چیست توحید خدا آموختن پیشِ واحد خویشتن را سوختن

گر ہمی خواہی کہ بفروزی چو روز ہستیِ ہمچون شبِ خود را بسوز

دو مگو و دو مداں و دو مخواں بندہ را در خواجۂ خود محو داں

دیوان میں مسئلۂ توحید یعنی ایک کے ہو رہنے پر مولٰنا نے بیحد زور دیا ہے اور اس میں جوش اور غیرت دلانے کا ان کا جو خاص انداز ہے، وہ ہر جگہ نمایاں ہے،

صوفی شعرا میں اگرچہ ہر ایک نے اصولاً اسی مسئلہ کو بنیاد ٹھہرایا ہے، لیکن ان جذبات کا اظہار ان کے کلام اور ان کے بیان کا جزوِ اعظم نہیں ہے، مثلاً جامی کا رنگ زیادہ تر نعتیہ ہے، سعدی، خسرو اور حافظ نے پیرایۂ مجاز اختیار کیا ہے، خواجہ حافظ فرماتے ہیں،

از دل و جاں شرفِ صحبتِ جاناں غرض است ہمہ این ست وگرنہ دل و جاں ایں ہمہ نیست

ان کے کلام میں یہ مضمون بکثرت نہیں آتا، جیسے اور مضامین آتے ہیں،

البتہ عراقی اس خصوص میں ایک حد تک مولانا کے ہمرنگ ہیں،

مرا جز عشقِ تو جانے نمی بینم نمی بینم دلم را جز تو جانانے نمی بینم نمی بینم

لیکن دونوں کا اسلوبِ ادا بالکل جداگانہ ہے،

مولانا کے دیوان میں خیال اور بیان کے زور، اور جوش کی روح یہی مسئلہ ہے، اس گلزارِ توحید کے چند پھول ملاحظہ ہوں،

ایک کا ہو رہنا،

از بہر خدا عشق دگر یار مدارید در مجلسِ جاں فکرِ دگر کار مدارید

یار دگر و کار دگر کفر محالست در مذہبِ حق مذہبِ کفار مدارید

مولانا کے نزدیک ظہورِ کثرت کا مقصد ہی حصولِ توحید ہے،

اے از جمالِ حسنِ تو عالم نشانۂ مقصود حسنِ تست دگرہا بہانہ

اگر عکسِ غیر آبِ حیات میں بھی ہو تو مولٰنا کے نزدیک ہیچ ہے،

ہر آں آبے کہ در روے عکسِ غیر است

اگر آبِ حیات است آں نشاید

بے گانگی خارِ عشق ہے،

ہرچہ غیرِ خیالِ معشوق است خارِ عشق است اگر بود گلزار

خارِ بے گانہ را تو یکسو کن، خارِ گل را بجاے دل می دار

گر تو خواہی وطن پر از دلدار خانہ را رو تہی کن از اغیار

مولٰنا کو صرف جمالِ حق منظور ہے، اور وہی مشہود ہے،

مرا غیر تماشاے جمالت نباشد در جہاں خود کارِ دیگر

کائنات کے سارے مشاغل سے عشقِ حق اپنے لئے انتخاب کیا ہے،

از جملہ جہان و عیشِ عالم من عشقِ تو اختیار کردم

اس اعلیٰ نسبت کے بعد ادنیٰ نسبت کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی،

چونکہ کمر بستہ ام بہر جہاں جے بجد

از پۓ ہر ستارہ ترکِ قمر چرا کنم

ترکِ شہودِ حق

تو ئی آفتاب چشمم بجمال تست روشن،
اگر از تو باز گردم بکہ چشم باز دارم،

ہمہ جمالِ تو بینم چو چشم باز کنم ۔ ہمہ شراب تو نوشم چو لب فراز کنم

بایں بہانہ درین بزم محرمے جویم ۔ غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

پیغام گوئی عہد جدید میں پیغام گوئی شاعری کی ایک خاص نوع سمجھی جاتی ہے، اور اسکی آجکل علمی و ادبی حلقوں میں اہمیت بھی بہت زیادہ ہے، جب شاعر کا کلام سامنے آتا ہے، تو اس کے دفتر معنی مین یہ تلاش کیا جاتا ہے کہ آیا اس نے زندگی کے متعلق کوئی خاص نصب العین اور کوئی خاص تصور پیش کیا ہے، یا نہیں، اس کے پاس بنی نوع کے لئے کوئی خاص پیغام بھی ہے یا نہیں، جس کسی شاعر کے کلام میں یہ صفت پائی جاتی ہے، اسے پیغام گو اور اس شاعری کو پیغام گوئی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے،

اردو مین اکبر اور اقبال دو زبردست پیغام گو شاعر ہین، اسی بنا پر ایک کو ترجمان حقیقت اور دوسرے کو لسان العصر کہتے ہین، چونکہ اس دور میں شاعری کے اس رنگ کی قدر ہے، اس لئے اس رنگ کی اہمیت محسوس کیجا رہی ہے، سوال یہ ہے کہ پیغام گوئی کی تعریف کیا ہے،

کہا یہ جاتا ہے کہ جب کوئی شاعر زندگی کے بنیادی حقائق، اور عروجِ انسانی کے اساسی اصول کو موزون اور پراثر کلام کی صورت میں بطور پیام پیش کرے، اور مخاطب کے لئے خیال اور عمل کی ایک مخصوص راہ منتخب کرے، تو اس قسم کی شاعری کو پیام گوئی سے موسوم کیا جاتا، اور شاعر اسی روشنی میں پیغامبر کہا جاتا ہے، اسی نقطۂ نظر سے گرامی مرحوم نے علامۂ اقبال کے متعلق لکھا ہے،

در دیدۂ معنی نگہان حضرتِ اقبال ۔ پیغمبری کرد و پیمبر نتوان گفت،

لیکن اس سے اخلاقی پند و نصائح کی وہ صورت خارج ہے، جو بوستان وغیرہ مین پائی جاتی ہے، یا اردو میں مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی کی نظمون میں ہے،

فارسی شاعری کے صوفی اور رند مشرب شعراء کے منظومات مین اپنے اپنے مشرب کے مطابق کچھ نہ کچھ ایسا پیام ملتا ہے مثلاً عطار اور عمر خیام کا کلام لیکن وہ اتفاقیہ ضمنی یا غیر شعوری طور پر ہے جس کسی کے کلام مین حقائق کی ترجمانی ہے تو وہ بصورت پیام نہین، برخلاف اس کے مولانا کے کلام مین یہ رنگ غالب ہے، اور مولانا نے عمداً یہ رنگ اختیار کیا ہے، شاعری اونھون نے اسی لئے اختیار کی ہے، ان کے لئے غزل یا مثنوی صرف ایک بہانہ ہے، جس کے ذریعہ سے انھین پیام آشنا بحرم راز یا گوش آشنا تک پہونچانا مقصود ہے، جامی نے اون کے متعلق بالکل سچ کہا ہے، کہ ع

نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

شاعری انھین اس لئے ملی ہے کہ اون کا پیام جذباتی رنگ کے ذریعہ لوگون کے دلون تک پہونچ جائے، ان کی شاعرِی ان کے پیغام کے تابع ہے، اس کی تاریخی شہادت ہم نے پچھلے مباحث مین درج کردی ہے،

پیغام گوئی کے نقطۂ نظر سے مولانائے روم اس زمانہ سے دور حاضر تک فارسی زبان کے سب سے بڑے پیغام گو شاعر ہین،

البتہ اس دور مین ڈاکٹر اقبال ہی فارسی کے ایک ایسے شاعر ہین، جنھون نے مولانا کے کلام کی اس خصوصیت کو کامل طور پر محسوس کیا، اور اس کے قدر شناس ہین، اس رنگ کو خود اونھون نے ایک خاص مجتہدانہ طریقہ پر حیرت انگیز ترقی دی ہے، اسرار خودی مین اقبال نے اس کا اقرار کیا ہے،

باز بر خوانم ز فیضِ پیر روم ۔ دفتر سربستہ اسرارِ علوم
جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار ۔ من فروغِ یک نفس مثلِ شرار
پیر رومی خاک را اکسیر کرد ۔ از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
موجم و در بحرِ او منزل کنم ۔ تا درِ تابندۂ حاصل کنم،

من کہ مستہا ز صہبا یش کنم،

زندگانی از نفسہایش کنم،

بمصداق مشتے نمونہ از خروارے مولانا کے پیامات کی طرف توجہ کیجاتی ہے، مولانا مادی ذہنیت اور مادی زندگی کے سخت مخالف ہین، وہ انسان سے مخاطب ہوکر یہ پیام دیتے ہین کہ تیری ہستی اشرف ہر خلائق ہے، تو صرف ادنی چیزون پر کیون نظر کرتا ہے، اور قانع ہوتا ہے،

حرص کاہ وجو مدار و خرمان در آب و گل تا نمانی زاب و گل مانند خرا ندر خلاب

چون بسگ نان افگنی سگ بو کند آنگہ خورد سگ نہ شیری چہ باشد بہر آن چندین شتاب

عشق مست و عاشق است کہ باقیست تا ابد دل بر حبد منہ کہ بجز مستعار نیست

رجائیت و پیغام طرب، مولانا صاحب ولایت ہین، ولایت اور حزن و خوف مین تضاد ہے، چنانچہ قرآن مجید مین وارد ہے، الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون بندۂ مسلم طریق رضا اور راہ ہستی مین کوکب درخشان کی طرح تبسم بر لب گذر جاتا ہے، غیر اللہ کا خوف آزادانہ عمل کا دشمن ہے، اور یہی حریت اور زندگی کے میدان مین راہزنی کرتا ہے،

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر از نبی تعلیم لا تحزن بگیر،

قوتِ ایمان حیات افزایدت ورد لا خوف علیھم بایدت

چون کلیمے سوے فرعونے رود قلب او از لا تخف محکم شود

گر خدا داری زغم آزاد شو،

از خیالِ بیش و کم آزاد شو،

(باقی)

نطشے

از جناب پروفیسر معتضد ولی الرحمن صاحب ایم اے جامعہ عثمانیہ،

یہ مضمون پروفیسر ایف ایس شلر کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جو اونھون نے کوارٹرلی ریویو بابتہ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء مین لکھا تھا اور بعد مین اون کی کتاب (Must Philosophy Be a Dogma?) مین بعنوان بابِ پنجم شائع ہوا، (مترجم)

تقریباً چالیس برس قبل فریڈریخ نطشے پاگل خانے مین داخل کیا گیا، جہان سے موت کے ہاتھون نے اسے باہر نکالا، اس تمام عرصے مین براعظم پر بہ حیثیت پیغمبر اس کی شہرت روز افزون رہی، جنگِ عظیم کے شروع ہونے کے وقت چند فلسفیانہ مزاج مشاہیر نے دنیا کو خود اپنی ہستی سے واقف کرانے کی استعدادی کوشش کی جس مین اونھون نے قیصر ولیم ثانی کے عہدِ حکومت مین جرمن حکمتِ عملی کی تمام پریشان خیالیون کی روحانی ذمہ داری نطشے کے سر تھوپنی چاہی، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس تمام کوشش کے باوجود نطشے کی تعلیمات نے انگلستان مین جڑ نہ پکڑی، اس کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ خیالات و افکار کی دنیا مین برطانوی تفکرات کی تنگ دلی نہین تو علیحدگی ایک بالکل حقیقی واقعہ ہے، سر دست ہم کو اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہین، کہ یہ علیحدگی طبعی ہے یا کسبی، یا یہ کہ یہ تفکر کی ان ندرتون کے خلاف ایک نازک تعصب کا نتیجہ ہے، جو ایک ایسے نظامِ تعلیم کی قدامت پرستی سے پیدا ہوتی ہین جو اگر ناکام رہتا ہے، تو نئی تصورات من حیث ہی اُکی طرف سے ایک نہایت عمیق بے اعتمادی کا باعث ہوتا ہے، اور اگر کامیاب ثابت ہوتا ہے تو ارسطو کو اب بھی فلسفیانہ تفکر و تدبر کا پہلا اور آخری نمونہ ظاہر کرتا ہے، لیکن اب نطشے سمندر کو عبور کرکے انگلستان مین داخل ہو چکا ہے، لہذا اوسکی تصانیف اوسکے پیشرووں یعنی کانٹ اور ہیگل کی تصانیف کے مقابلے مین بہت زیادہ اور اچھی طرح سمجھکر پڑھی

جائین گی، کانٹ اور ہیگل تو اس سے آگے نہ بڑھ سکے کہ ان کے نام کا بجوِن اور یونیورسٹیون کے تربیت یافتہ
فلسفیون کے ہاتھون مین عوام کالانعام کو مرعوب کرنے کا آلہ بنجائین، اس کے برعکس نٹشے کی تحریر
زوردار ہوتی ہے، اور سیدھی مطلب پر پہونچتی ہے، مدت العمر کے مطالعے کے بغیر بھی اس کی تحریر
بلکہ سمجھی جاسکتی ہے، اور ہوسکتا ہے کہ اس کے خیالات کردار پر اثر آفرین ہون، جن خیالات کا وہ
وکیل ہے، ان کو کبریائینا[۱] کے مریض کی پریشان خیالی کہکر حقارت کے ساتھ ہونٹ بچکانا تو بہت سہل
ہے لیکن دنیا کی موجودہ حالت مین وہ متعدی ثابت ہوسکتے ہین، اور اگر کچھ دن اور دنیا کی یہی رفتار
رہی تو فوق الانسان[۲] کا عقیدہ عمرانی کرشمے کے عقیدے کے مقابلے مین زیادہ مرجح معلوم ہوگا،

(۱)

لہذا ہم کو یہ خیال دل سے فوراً نکال ڈالنا چاہئے کہ زندگی کے متعلق نٹشے کی رائے جنون محض ہے
اس لئے ناقابلِ التفات ہے، نوعِ انسان کی تاریخ مین نئے خیالات و افکار کی پیدایش اس قدر نادر
واقعہ ہے کہ ہم اون خیالات و افکار کو نظر انداز نہین کر سکتے، خواہ اون کی پیدایش ایک بالکل غیر مرتب
مقام ہی مین ہوئی ہو، علاوہ ازین ولیم جیمس نے ہمین بتایا ہے کہ "طبی مادیت" (medical materialism)
یعنی کسی مصنف کی فعلیاتی (Physiological) حالت سے اوس کے خیالات و
افکار کی تثمین و تقدیر کا عقیدہ بالکل سست بنیاد ہے، اب یہ یقین کرلینا بہت دشوار ہے کہ چونکہ ایک مصنف
فاترالعقل تھا، لہذا اوس کے خیالات بھی بعید از عقل ہین، یا چونکہ یہ خیالات بعید از عقل ہین، لہذا اون کی
کوئی قیمت نہین، اور اس سے بھی کمتر یہ کہ ان کی کوئی اہمیت نہین، یہ قول کہ ہر نادر طبع
(Genius) شخص فاترالعقل ہوتا ہے، بلاشبہ اتنا ہی غلط ہے، جتنا یہ قول کہ ہر فاترالعقل

[۱] جنون کی ایک قسم ہے جس کا مریض اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتا ہو، انگریزی مین اوس کو Megalomania
کہتے مین، کسی نے انسان کی تعریف کی ہے کہ یہ بندر کی وہ نوع ہے جس کو کبریائینا کا مرض ہو، (مترجم) [۲] Superman

شخص نادر طبع ہوتا ہے، اکثر فاترالعقل اشخاص بالکل کند ذہن ہوتے ہین، لیکن نادر طبع اشخاص کی ایک خاص
صنف بہ ظاہر فتورِ عقل سے بہت قریب ہوتی ہے، اور تہذیب و تمدن کے بعض پہلو کسی ذی فکر انسان کو
فاترالعقل بنانے کے لئے کافی ہین، بالعکس یون کہا جاسکتا ہے، کہ فاترالعقل اشخاص چونکہ رسمی تثمینات
و تقدیرات کی گرفت مین بہت کم ہوتے ہین، لہذا بعض اوقات وہ نادر طبع اشخاص کے بہترین جانچنے
والے اور اون کو سب سے پہلے معلوم کرنے والے ہوتے ہین، چنانچہ کوئی لکھا پڑھا شخص اس واقعے کو نہین
بھول سکتا کہ دنیا کو واگنر (Wagner) کی موسیقی کی عمدگی کا یقین دلانے کے لئے ایک
مخبوط الحواس بادشاہ کی ضرورت تھی، علاوہ ازین یہ مسئلہ بھی حل طلب ہے کہ ایسا بری عن الخطا حکم کہان سے
آئیگا، جو خیالات و افکار کی صحت و استقامت پر حکم لگائیگا؟ فلسفہ اور مذہب کے عقائد اس قدر متباین
ہوتے ہین کہ ہر شخص یہ شبہہ کرنے پر مجبور ہے کہ خود اوس کے علاوہ باقی تمام دنیا فاترالعقل ہے، پھر ہم
قطعیت کے ساتھ یہ بھی ثابت نہین کر سکتے کہ ہم سب فاترالعقل نہین ہین، بلکہ یہان تک کہا جاسکتا ہے
کہ معائنے کے بعد غالباً معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ مشہور اشخاص کا ایسے عقائد پر ایمان ہوگا، جن کو تمام
دنیا، یا خود اون کے علاوہ باقی سب پاگل پن کہین گے،

(۲)

نٹشے کی تصانیف کو تنقیدی نگاہ کے ساتھ چھان بین کرنے کی ضرورت ہے، یہ نہ صرف اس لئے
کہ آخری زمانے مین اس کی حالت بہت زبون ہوگئی تھی، بلکہ اس حیثیت سے بھی، جو مصنف نے
ان تصانیف کو دی ہین، نٹشے اپنے خیالات کو چھوٹے چھوٹے مقولون کی صورت مین بیان کرنا مرجح
سمجھتا تھا، اور یہ غالباً اس کے کام کرنے کے خاص طریقے کا نتیجہ تھا، لیکن ایسے مقولے طبعاً استبعاد
اور مبالغے کی طرف لیجاتے ہین، لہذا اس کی تصانیف پر حکم لگاتے وقت ان کے اثرات کو خارج
کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، تاہم اس نے اپنی تصنیف "Will to Power"

(جس کو وہ اپنا شاہکار بنانا چاہتا تھا) کے جو مسودے اپنے پیچھے چھوڑے ہین، ان سے خصوصیت کیساتھ معلوم ہوتا ہے کہ تصنیفی مشاغل کے آخری زمانے مین وہ اپنے خیالات کو باقاعدگی کے ساتھ ظاہر کرنے کی طرف بہت زیادہ مائل ہو گیا تھا، ان ہی سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے مقولون نے انداز اظہار کی مخصوص صورت اختیار کر لی تھی، نہ کہ نفسیاتی ضرورت کی، اور یہ کہ اس کے خیالات اس سے کہین زیادہ مربوط تھے، جتنا کہ وہ بظاہر معلوم ہوتے تھے،

(۳)

لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ نٹشے نے اپنی قابلیت کے اندازہ کرنے مین مبالغے کی وجہ سے اپنی تصانیف کو مسخ کر دیا ہے، اس نے تنہائی مین اس قدر زمانہ گذارا ہے کہ نسبت کا جو احساس اس مین تھا بھی وہ بھی مفقود ہو گیا، اپنی خود نگاشتہ سوانح عمری مین جس کو وہ اپنے مخصوص انداز مین (EccE Homo) کے نام سے موسوم کرتا ہے، اس نے اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے کی ایک مجنونانہ کوشش کی ہے، اس لئے اس مین کبریائی کا اظہار ضرورت سے زیادہ ہے، ہم مین سے ہر شخص کا خود اپنے متعلق ان لوگون کے مقابلہ مین اعلیٰ رائے رکھنا، جو ہمارے کام سے بہت کم واقف ہین، اور خود اپنا اندازہ اپنے کامون سے نہین، بلکہ اپنی صلاحیتون سے کرنا، ایک طبعی امر ہے، اور کشمکشِ حیات کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے شاید ضروری بھی ہے، اس سے کوئی خود نگاشتہ سوانحعمری یقیناً بیکار نہین ہو جاتی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے اس نفسیاتی دلچسپی مین اضافہ ہو جائے، لیکن نٹشے کی خود نگاشتہ سوانحعمری نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت مایوس کن ہے، اس سے اس کی سیرت اور اس کے تفکر کی پیدائش و ترقی پر بہت کم روشنی پڑتی ہے، اس مین ایک نافہم دنیا کی غفلت پر اس پیغمبر کی ناراضگی کا اظہار ہوا ہے، اس سے ہمارے اس استعجاب کی تشفی نہین ہوتی کہ ایک جرمن پروفیسر نے علم کی قیود کے خلاف کیون اور کس طرح علمِ بغاوت بلند کیا، اس سے یہ بھی معلوم نہین ہوتا

کہ ایک جرمن پادری کا لڑکا جس کی تمام تربیت شولپ فورٹا (Schulpforta) (جو گویا ونچسٹر (Winchester) کا مماثل ہے) مین ہوئی، کس طرح مسیحیت کی جان کا دشمن، قنوطی، اور شوپنہائر کا پرستار بن گیا، پھر اوس نے شوپنہائر اور واگنر دونون کو کیون ٹھکرایا، اور ایک بیوہ مان اور نا کتخدا بہن کے ہوتے ہوئے گوشہ نشین راہب کی زندگی کیون اختیار کی، جس مین وہ اپنے تقریباً تمام دوستون سے الگ رہا، خود اس نے اپنے متعلق، یا اورون نے اس کے متعلق جو کچھ شائع کیا ہے اس سے اس کی شخصیت کا معمہ حل نہین ہوتا، حال آنکہ یہ ظاہر ہے کہ ان مین سے کوئی نہ کوئی شخص ایسا ضرور ہوگا جو ان سوالات پر روشنی ڈال سکتا تھا،

اس روشنی نہ ڈالنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس سے اس پیغمبر کی عبا کے سوراخ بہت زیادہ نمایان ہو جاتے ہین، یہ بعید از قیاس نہین کہ جب نٹشے نے ایک مرتبہ بہن کو خط مین لکھا کہ "میرے اچھے دوست میرے متعلق کچھ نہین جانتے، اور اونھون نے ابھی تک اس مسئلے پر غالباً غور ہی نہین کیا، مین خود اپنے بڑے بڑے معاملات کے متعلق ہمیشہ بہت زیادہ خاموش رہا ہون، اگرچہ بظاہر ایسا معلوم نہین ہوتا" تو اوس نے سچی بات لکھی ہو، اس قسم کے لوگ بھی دنیا مین پائے جاتے ہین، یہ لوگ بالعموم روزنامچے لکھنے پر قناعت کرتے ہین، لیکن بعض اوقات وہ اپنے روزنامچے طبع کرا کے امیدوار رہتے ہین کہ دوسرے ان مین وہی دلچسپی لین گے، جو وہ خود لیتے ہین، اور اون کے احباب نہین لیتے، اس سے یہ شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ ادبیات کا بڑا حصہ اسی محرک کا نتیجہ ہوتا ہے، ایک خبطی کی لکھی ہوئی فلسفے کی ایک عجیب و غریب کتاب مین مین نے یہ نہایت بے تکلفانہ اعتراف پڑھا تھا کہ اس نے یہ کتاب اس لئے لکھی ہے کہ خود اوس کے خیالات اوس کی سمجھ مین آجائین، اس وقت سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ اکثر مشاہیر فلاسفہ کا بھی حقیقی راز ہے، بہر حال نٹشے کی تصانیف تو اولاً اسی قسم کے ادبیات سے تعلق رکھتی ہین، یہ ایک ایسی روح کے ارتقا کی ضمنی پیداوار ہین، جس کی ترقی ۴۴ برس کی عمر مین یکدم رک گئی، اس سے ایک خطا ہین

جو اپنے ایک دوست (Erwin Rohde) کے نام لکھا تھا اس کا اعتراف کیا ہے
اُس نے (بلا تخصیص) بیان کیا ہے، کہ اس پر لیوپارڈی (Leopardi) سے زیادہ بیتین
پڑی ہین، اور یہ کہ ۱۸۷۶ء کے بعد جو ادب اوس نے پیدا کیا ہے، وہ زندگی سے نفرت کے لئے
خانہ ساز دوا ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ نٹشے بہت سی رعایات کا مستحق ہے، وہ گوشۂ تنہائی مین زندگی بسر
کرتا تھا، اور اوسکو محسوس ہوگیا تھا، کہ اس کی تصانیف اور اون کا مواد، عام تنقید نویسون کیلئے
اس قدر نئے ہین کہ ناقابلِ فہم ہوگئے ہین، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ بھی شوپنہائر کی طرح برہم ہوگیا، لہذا وہ
روحانی صحرا مین حلق پھاڑ پھاڑ کر چلایا، اور اس کو ایسے ایسے خواب دکھائی دیئے جن کی وجہ سے حقیقت
مسخ اور اصلیت سے زیادہ بڑھ گئی، لیکن ان تمام باتون کو خارج کر دینے کے بعد بھی اس کی تصانیف
مین بڑا حصہ ایسا باقی رہجاتا ہے، جو پر زور، بینا اور اہم ہے، اور جس کو بہت بارآور اور آیندہ ترقیون کا
پیش خیمہ کہا گیا ہے، اگر ان ترقیون نے اسی زمانے مین استبعادات کو رفع کر دیا، اور نٹشے کے خیالات
کی تیزی و تندی کو کم کر دیا، تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ خیالات ان غیر معمولی حالات سے متاثر
ہوئے، جن مین ان کی پیدایش اور پرورش ہوئی،

لہذا اگر ہم نٹشے کو ایک بڑا ادیب" اور ایک ایسے خاص طرزِ تحریر کا موجد سمجھنے کے وسوسے
سے بچنا چاہتے ہین، جس نے کرخت جرمن زبان سے نئی نئی طرح کی باتین کہلوائین، اور اگر ہم بہ اتفاق
اس کو پیغمبرون کی حد تک پہنچائے بغیر ایک مفکر سمجھنے کے لئے تیار ہین، تو ہم کو اس کے نظریات
عمل و علم پر زیادہ تر غور کرنا چاہئیے ان مین سے مقدم الذکر خصوصیت کے ساتھ نہایت عجیب
و غریب حیرت انگیز اور مشہور لیکن ساتھ ہی کم ٹھوس ہین، اور موخر الذکر اغلباً زیادہ اہم اور بامعنی ہین، اور ان ہی
کی بنا پر نٹشے زمانۂ جدیدہ کے تفکرات کی مثالی ترقی مین ایک مستقل جگہ پاتا ہے،

(۴)

نٹشے کا فلسفہ بیان کرتے وقت عوام اپنی تمام لیاقت اور اپنا پورا زور صرف یہ واضح کرنے پر ختم
کر دیتے ہین، اور یہ خیال خود بھی سمجھتے ہین کہ اونھون نے نٹشے کا تمام فلسفہ بیان کر دیا، کہ وہ ایک سفاک
انقلاب پسند تھا، جو جدید تہذیب و تمدن کے نصب العین اور خیالات کی دنیا مین تلوار ہاتھ مین لئے
دیوانہ وار پھر رہا ہے، اور بلا تخصیص و امتیاز ان سب کو قتل کرنا چاہتا ہے، وہ ایک ایسا ملحد ہے، جو
بانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ خدا مر چکا ہے، وہ مسیحیت کا وہ مخالف ہے، جو اپنے آپ کو فخراً دجال کہتا
ہے، وہ اخلاق کا وہ دشمن ہے جو دعویٰ کرتا ہے کہ اخلاق ایک غلامانہ ذہن کے انحطاط پذیر توہم سے
زیادہ اور کچھ نہین؛ وہ ایک نواب ہے جو عوام کا انعام کو ان کی اصلی جگہ بتاتا ہے، اور یہ جگہ حکمران
طبقے کے "خونخوار وحشیون" کے پاؤن کے نیچے ہے، وہ ایک مورخ ہے، جس نے تاریخ کو آزاد اور
طاقت ور حاکمون اور ان کے باغی غلامون کے درمیان ایک ارضی کش مکش کا افسانہ کہا ہے، وہ
ایک قوی الروح رجائی (Optimist) ہے، جس کا ہیرو کا ساسخت استقلال
زندگی کی ابتدائی صورت کو دوبارہ بیان کر کے زندگی کی الم انگیزیون کے متعلق قنوطیون (Pe-
ssimism) کے سوقیانہ آہ و نالہ پر غلبہ پاتا ہے، وہ ایک شاعر ہے، جو طاقت ورون کی فتح کے
گیت گاتا ہے، اور کمزورون کی محکومیت پر خوش ہوتا ہے، وہ آنے والے فوق الانسان کا پیغمبر
ہے، جس نے تمام قیمتون کو بدل دیا ہے، اور احکام کی نئی فہرست بنائی ہے، اور جو اس کائناتی کھیل
کی تمام تفصیلات کے "ابدی اعادے" کی پیشین گوئی کرتا ہے، جس کا نہ کوئی مقصد ہے، نہ کوئی غایت
اور جس کے خود اپنے علاوہ اور کوئی معنی ہین، آخری بات یہ ہے کہ نٹشے انسانی خود بینی کا دقیق خوشامدی
ہے جو ہمیشہ کہتا رہتا ہے کہ جو شخص جرأت کر کے اس کے مذہب کو قبول کر لیتا ہے، وہ خود اپنی برتری کا
اظہار کرتا ہے، اور جید ذہنون کی جماعت مین شریک ہو جاتا ہے،

اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ نٹشے کی تصانیف مین ان تمام دعوون کی بہ کثرت مثالین ملتی ہین،
لیکن یہ اس کے عقائد کی سطحی معنی ہین، اور اس سے یہ نتیجہ نہین نکلتا کہ یہ اس کے پورے معنی ہین، یا یہ کہ جس
شکل مین ان کو بیان کیا جاتا ہے، وہ اس کی تصانیف کے بہترین حصے ہین، جن پر غور کیا جانا ضروری
ہے، اور یہی تنقید مین سب سے زیادہ مزاحم ہوتے ہین، طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس قسم کی تنقید اس کے عقائد کو
انقلابی نوعیت سے معرا کر دیتی ہے، مثلاً کوئی متین و سنجیدہ شخص نٹشے کو دجال نہ سمجھے گا، مذہب بالعموم
اور مسیحیت بالخصوص، ایسی چیزین نہین، جن کو کسی شخص کی فصاحت و بلاغت کا سیلاب بہا کر لیجائے،
جب تک لوگ ہر اوس چیز کو "خدا" کہنے کے لئے تیار ہین، جو اس بات کی ضامن ہے کہ کسی نہ کسی طرح
ہر چیز درست ہے، اور جو ہر اوس عقیدے کو "مسیحیت" کے ساتھ ملحق کرنے پر آمادہ ہین، جس سے انکی
برترین تمنائین مرکب ہین، اس وقت تک یہ کہنا مہمل ہے کہ خدا مر چکا ہے اور مسیحیت بے کار ہو گئی ہے،
دنیا پر روز بروز روشن ہوتا چلا جا رہا ہے کہ مذہب محض عقلی ضوابط پر نہین بلکہ ضروریات زندگی پر
مبنی ہے، اور جدلیات اس کو مٹا نہین سکتے،

(۵)

نٹشے کی عدم اخلاقیت مین بھی بہت مبالغہ کیا گیا ہے، یہ عدم اخلاقیت دراصل اس روایتی
اخلاقیت کی متضاد ہے، جس کی قیمت کا وہ منکر ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہین کہ اس کا عقیدہ
ہے کہ ہر شخص جو کچھ چاہے کر سکتا ہے، اور اس کے ہیجانات پر کوئی روک نہین، وہ یہ ضرور تسلیم کرتا
ہے کہ عمل محض "اخلاقی اصول" کا سوال نہین بلکہ اصلاً ہیجانات کا سوال ہے، لہذا ہمارے لئے لازمی
ہے کہ ہم اپنے ہیجانات کو سلیم و صحیح بنائین، "رہبانیت" تمام نقائص سمجھنے کے باوجود اس کا ایمان ہے
کہ ایسے اعلیٰ انسان کو اس کے مرضی کے مطابق بنانے کے لئے شدید تربیت (اور دراصل یہی تربیت
رہبانیت کی غایت تھی) کی ضرورت ہے، جس کی زندگی مسرات و لذات کے جویا کی زندگی سے یقیناً

مختلف ہو گی، لیکن اس کے ساتھ اس کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ "آقایانہ" اخلاقیت کی نئی قیمتون کو قائم کرنے
کے لئے اس "غلامانہ" اخلاقیت کی قدیم قیمتون کا انکار لازمی ہے، جو مسیحیت نے ہمارے سر تھوپی ہین،
اس طرح اس کی عدم اخلاقیت "تجاوز عن القیمت" (Transvaluation) کا ایک اجمالی پہلو بنجاتی ہے،
یہ ایک اہم اور گران بہا خیال ہے، اور نٹشے مستحق داد ہے، کہ اوس نے ہم کو اس سے روشناس
کرایا، مسئلہ قیمت کا انکشاف انیسوین صدی کے فلسفیانہ تفکر کا غالباً سب سے بڑا کارنامہ ہے، لیکن حیرت
یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ یہ انکشاف کس قدر بتدریج اور خفیہ طریقہ سے ہوا، اور جو مفکرین کہ گذشتہ زمانے کے
رنگ مین رنگے جا چکے ہین، وہ اب بھی اس کی اہمیت کو کس قدر کم سمجھتے ہین، یہ مسئلہ غالباً قنوطیت کی ترقی
سے زیر بحث آیا ہے، اگر ہم رجائی اور قنوطی تمنیات زندگی کے تصادم پر غور کرین، تو معلوم ہو گا کہ دونون
عقائد مین واقعات بجنسہ ایک ہی ہین، اس طرح ہم اس عام تر سوال پر پہنچ جاتے ہین کہ واقعات کے متعلق
ہماری رائے سے نفس ان واقعات مین کیا فرق پڑتا ہے؟ اس سوال کی روشنی مین سب سے پہلے تو "واقعات"
اور "قیمتون" کے تضاد کو تسلیم کرنا پڑتا ہے، جو انیسوین صدی کے نصف ثانی مین رونما ہوا، اور جس کا نمایان
اظہار رتش (Ritsch) کی دینیات مین ہوا ہے، کہا جاتا ہے کہ "واقعہ" ایک چیز ہے، اور
اس کی تثمین بالکل دوسری اور جداگانہ چیز ہے، واقعے کی نوعیت لازماً اس کے متعلق کسی شخص کی رائے کو
معین نہین کرتی، لہذا ایک ہی واقعہ کی مختلف و متنوع قیمتین ہو سکتی ہین، اور قیمتون مین ان تغیرات سے
ان کے انسانی معنی متغیر ہو سکتے ہین، مختصر یہ کہ جیسا کہ نٹشے نے بہ وضاحت معلوم کر لیا تھا، "تثمین تخلیق ہے"
علاوہ ازین فنون، اخلاق، اور مذہب کی دنیا مین حقیقی اہم واقعات انسانی تثمین کے ایسے ہی واقعات
ہوتے ہین، لیکن شروع شروع مین یہ نظر نہین آتا کہ واقعے اور قیمت کا یہ تضاد بالآخر باقی نہ رہے گا،
جن "واقعات" کو ہماری سائنس تسلیم کرتی ہے اون مین قیمت کے وہ قضایا بھرے پڑے ہین جنکے متعلق خیال تھا کہ وہ
ان واقعات پر مخصوص انسانی اضافے ہین، تاہم یہ واضح ہے کہ قیمت کا ہر قضیہ واقعے کے درجے

کے متبادل دعویدار کے مقابلے مین لازماً مرجح خیال کیا گیا ہوگا، کیونکہ جن ماہرین نے یہ قضایا قائم کئے ہین، اونھون نے ان کو دیگر دعویدارون کی بہ نسبت زیادہ قیمتی کہا ہوگا، مختصر یہ کہ ہر قضیہ مین انسانی تثمین پوشیدہ ہوتی ہے، اس طرح یہ استدلال کلی "انسانیت" (Humanism) پر جاکر ختم ہوتا ہے،

(۶)

نٹشے کی تحلیل اس حد تک نہ پہونچی تھی، لیکن دنیائے فنون مین تثمین کا حیرت انگیز تغیر اس کی آنکھون کے سامنے ہوا، اور وہ اس سے بخوبی واقف تھا، اس نے اپنی آنکھون سے دیکھا کہ واگنر کی "موسیقی مستقبل" جس کو عام طور پر ناہموار کہہ کر مردود کر دیا گیا تھا، چند ہی برسون مین سخت کشش و کوشش کے بعد مقبول عام بن گئی، اب ہر شخص کے نزدیک صرف یہی سننے کے قابل تھی، خود نٹشے بھی اس ہنگامے مین شریک رہا، اگرچہ بالآخر اس نے اپنے دوست کو عین فتح کے وقت برا بھلا کہا، اور چھوڑ دیا، کیونکہ اس نے پارسی فال (Parsifal) کو مسیحیت کے سامنے نہایت شرمناک طریقے سے ہتھیار ڈالنے کے ہم معنی کہہ دیا تھا، اگر وہ اتفاق سے اس قضیہ سے واقف نہ ہو جاتا، جسین دو ہزار برس قبل یوری پے ڈیس (Euripides) نے اس چیز کو مٹنے سے بچا لیا، جو اوس وقت مستقبل کی موسیقی تھی، اور اس موسیقی کے مصنف ٹموتھی اس (Timotheus) کے گلے مین سے پھانسی کا پھندا نکالا، اگر وہ یہ معلوم نہ کر لیتا کہ فیشن کی دنیا مین تثمین مین سالانہ تغیر ہوا کرتا ہے، اور یہ کہ ہر سال کے شروع مین اس مذاق کو مذموم قرار دینا لازمی ہوا کرتا ہے، جو سال بھر قبل جاری تھا، تو یہ واقعہ اس کو عجیب وغریب معلوم ہوتا، اور اس سے اخلاقی قیمتون سے تجاوز کے امکان کی طرف اشارہ ہوتا، لیکن اس مین کلام نہین کہ نٹشے نے اپنی قابلیتون کو اصلیت سے بہت زیادہ، اور تجاوزات عن القیمت کو حقیقت سے بہت کم سمجھا، یہ تجاوزات ہمارے گرد و پیش ہر جگہ اور

ہر وقت ہو رہے ہین، اور ایک فرد واحد تمام دنیا کی تثمینات پر متصرف نہین ہو سکتا، مختلف افراد ایک ہی شے کی مختلف قیمتین لگاتے ہین، لہذا یہ سوال ہمیشہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مین سے کس کی تثمینات بالآخر رائج ہون گی، متنازع قیمتون کی اس عمرانی کشمکش مین کم و بیش سنگین تغیرات کم و بیش سرعت کے ساتھ برابر واقع ہو رہے ہین، یہی قول قیمتون کی ایک ہی عام اسکیم پر بھی صادق آتا ہے، یہان تک کہ قیمتون کی مسیحی فہرست مین سے ریاضت اور رہبانیت بہ حیثیت اس کے اخلاقی نصب العین کے اجزائے مرکبہ ہونے کے عملاً چھانٹ دیئے گئے ہین، اس کے علاوہ آج کل بھی عیسائیون کے طرز سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ پرخوری کو اب بھی منجملہ سات مہلک گناہون کے شمار کرتے ہین، اس صورت حال مین مزید پیچیدگی اس واقعے سے پیدا ہوتی ہے، کہ اکثر قیمتون کے مطابق عمل تو کیا جاتا ہے، لیکن ان کو الفاظ مین بیان نہین کیا جاتا، اس کے برعکس بعض کو برائے نام تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ان کے مطابق عمل نہین کیا جاتا، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ درحقیقت ان کو مانا ہی نہین جاتا، کیونکہ کسی عقیدے کے خلوص کا سخت ترین امتحان یہ ہے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے، مختصر یہ کہ جن قیمتون پر ہم اعتقاد رکھتے ہین، ان کو "ابدی" کہنے مین ہم خواہ کسی قدر سرگرمی کا اظہار کیون نہ کرین، ہم اون کو "ابدی" کہکر حقیقت کی گردش سے مستثنیٰ نہین کر سکتے،

(۷)

ماحصل اس کا یہ ہے کہ نٹشے کا عقیدہ اتنا صحیح ہے کہ خود اس کو اس صحت کا اندازہ نہ ہوا، قیمتون کو بدلنا جتنا سہل ہے، اس سے کہین زیادہ دشوار بھی ہے، کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، اخلاقی قیمتون کو جمالی اور حزمی قیمتون کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اور پھر اکثر افعال پر مختلف طریقون سے نگاہ کی جا سکتی ہے، چینیون کا علم اخلاق آداب و مراسم کا محض ضابطہ معلوم ہوتا ہے، اس کے مقابلے مین یونانی علم اخلاق، احساس حسن پر تکیہ کرتا ہے نہ کہ "احساس فرض" پر، مطلب یہ ہے کہ فوق الانسان

کی اخلاقیت کو صرف ایک دشمن سے نہین بلکہ دشمنون کے جم غفیر سے مقابلہ کرنا ہے، اوران مین سے
ہر ایک اشخاص کے مختلف اصناف کو مرغوب ہے، جس مسیحی اخلاقیت کو نٹشے دبانا چاہتا ہی، وہ اگر
وتنہا نہ بھی اگر وہ تنہا ہوتی، تو آج تاریخ کا رخ بالکل مختلف سمت مین ہوتا، واقعہ یہ ہے کہ اس کو ہمیشہ
بہت سے متبادلات سے مقابلہ کرنا پڑا ہے، اور روح انسانی پر اون کے اثرات مین شرکت کرنی
پڑی ہی، اس عمل مین یہ قوی، ملائم اور دقیق ہوتی گئی، اگر نٹشے یہ سمجھ جاتا کہ مختلف و متنوع عمرانی و عسکری
ذاتون مین عزت و معقولیت، یا آداب و مراسم کے مختلف ضوابط کا مطلب کیا ہی، اور اگر وہ کاروباری
اور پیشہ ورانہ اخلاقیت، تاجرانہ رسوم اور اخلاقی طرز و طور (جو خصائص تخصیص سے بہت زیادہ مختلف
نہین) کے رواج کو معلوم کر لیتا، تو اوس کو اپنے مخصوص تجاوز عن القیمت کی کامیابی کا اتنا زیادہ یقین
نہ ہوتا،

پھر اس کا مجوزہ تجاوز عن القیمت اتنا نیا بھی نہین، جتنا کہ اس کا گمان ہے، اشتداد اور طاقت
کے عقیدے پر ہمیشہ عمل کیا جاتا رہا ہے، اگرچہ اس عقیدے کے مدون کرنے والے اس قدر مصروف
رہے ہین کہ اون کو اس کے اصول کے متعلق نظریات سازی کا وقت نہ ملا، لیکن یہ علمی عقلیت
(Academic) کا ایک مغالطہ ہے، کہ جو چیز طبع نہین ہوئی وہ صحیح نہین ہو سکتی،
نظریہ ساز سے کم از کم ایک بات کا تو مطالبہ کیا جا سکتا ہے، یعنی یہ کہ اس کو ایسے صاف اور واضح
تصورات دریافت کرنے چاہئین جو تمام واقعات پر حاوی ہون، لہذا ہم نٹشے سے بہ حیثیت اس کے
کہ وہ "طاقتور" کا وکیل ہی، یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہین کہ وہ "طاقت" سے کیا مراد لیتا ہی؟ اسکے حکمرانون کا تسلط کس چیز پر
مشتمل ہی؟ اور وہ کون سی صفات ہین جو اسقدر بیش بہا ہین، کہ اونکو حاصل کرنے کے لئے کرورون افراد کی مسرت اور زندگی کا
ایثار بھی کم ہی؟ کیا یہ طاقت محض جسمانی ہی؟ یا عقلی اور اخلاقی صفات بھی اسکی ترکیب مین شامل ہین؟ کیا ہم یہ کہین گے کہ
ہو کہ "طاقت ور" وہ ہی جو فی الواقع حکومت کرتا ہی، یا وہ جنکو حکومت کرنی چاہئے، اور جو عمرانی موانع کی عدم موجودگی مین

واقعۃً حکومت کرتے بھی ہی؟ مختصر یہ کہ اس نظریے کا مرافعہ دنیا کے مروجہ طریقے کی طرف ہی یا اسکے اور اکسی نصب العین کی طرف؟
یہ معلوم کر کے قارئین کو حیرت ہوگی کہ اس سوال سے ہم ایسے میدان مین پہنچ جاتے ہین جہان اکثر مناقشات ہوئے
ہین، چنانچہ افلاطون کا سقراط "جمہوریت" مین تھریسی ماکس (Thrasymarch) سے کہتا ہی کہ زبردست
اشخاص حکمرانون کے فائدے کیلئے اخلاقیت کو زیردستیون کے سر تھوپتے ہین، جو فی الواقع حکمران ہین، وہ تو اکثر غلطی کرتے
ہین، نصب العینی حکمران ممکن ہو کہ با اخلاق ثابت ہون، اس قول مین افلاطون نے نٹشے کی پیش بینی کی ہی، اسیطرح
ڈارونیت (Darwinianism) مین بھی "لیاقت" (Fitness) کا تصور
شامل معلوم ہوتا ہی، اور یہ تصور بھی نٹشے کی "طاقت" کے تصور کی طرح زیر بحث لایا جا سکتا ہی، کیا "لائق" وہ
افراد کہلائین گے جو فی الواقع باقی رہتے ہین، یا وہ جو کسی نصب العینی دنیا مین الیق ہونگے، ؟ اگر ہم پہلی صورت
تسلیم کرتے ہین، تو کیا بقاے الیق محض تکرار الفاظ نہین بنجاتا، ؟ اگر دوسری صورت تسلیم کیجاتی ہی، تو کیا ہم چوری
چھپے یہ کوشش نہین کر رہے ہین کہ تجربے "لیاقت" کے کسی ایسے انسانی نصب العین کی تصدیق کرائین جو ممکن ہی کہ اس حقیقی دنیا
کے گرم و سرد اور نشیب و فراز مین بقا کی "لیاقت" کو مطلق شامل نہ ہو؟ ڈارونیت تو اس بظاہر خوشنما لیکن حقیقۃً
لفظی جدلیات سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑاتی ہے کہ سائنٹفک واقعات کا علمی مطالعہ ہونا چاہئے، ڈارونیت
فرض کرتی ہی کہ ہر وہ چیز جو زندہ ہی لازماً ایسے کام کرتی ہی جس سے وہ باقی رہتی ہی، اسکے بعد پھر وہ سوال کرتی ہی کہ
جاندار مخلوق فی الواقع کس طرح عمل کرتی ہی، وہ کون سی صفات اور کون سے طرق عمل ہین جنکی وجہ سے باقی
رہنے والی مخلوق باقی رہتی ہی؟ وہ اون خطرات سے اپنے آپ کو کیونکر بچاتی ہی، جو اس کی زندگی کے لئے مہلک ہین،
اور کیا وہ پہلے کے مقابلے مین بہتر صورت مین باقی ہین، یا بدتر صورت مین؟ جب تک کہ بقا کے واقعی عمل کی پوری طرح
چھان بین نہین ہو جاتی، اس وقت تک ایک پکا اور سچا ڈارونی اس بات کی اجازت نہین دیتا کہ اس مسئلے کے
متعلق استنباجات کئے جائین کہ ہم کس طرح عمل کرین کہ خود ہماری یا اورون کی بقا کی امید بہتر ہو جائے، دوسرے الفاظ
مین حیاتیاتی تحلیل کو اخلاقی حکم سے علیحدہ رکھا جاتا ہی،

(۸)

نٹشے مین یہ تفریق مفقود ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اتنے عرصے پہلے پیدا ہوا کہ ڈاروینیت کے اصلی معنون کو پوری طرح سمجھ نہ سکا، کیونکہ جرمنی کے علم دوست طبقے مین ڈاروینیت بہت آخر مین مقبول ہوئی، نٹشے نے بھی کہین صاف اور بری عن التضاد الفاظ مین بیان نہین کیا، کہ "طاقت" سے اسکی کیا مراد ہے، اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خود اس کے ذہن مین اس کا کوئی واضح تخیل نہ تھا، بعض اوقات تو وہ اس کو محض جسمانی طاقت کے مترادف سمجھتا ہے، اور "تند خو بہائم" کو دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے، جو جنون نظام و ترتیب اور تمدن سے مساوی طور پر نفرت کرتے ہین، اور سب پر مساوی طور پر غالب ہین، لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی "طاقت" "مکر و فریب" کے سامنے قدم نہین جما سکتی، چنانچہ خود نٹشے نے واضح کیا ہے کہ انحطاط پذیر لوگون کے مذہبی پیشواؤن کی ترتیب دی ہوئی غلامانہ اخلاقیت آقاؤن کی تمینات پر غالب آئی، لہذا جن جملون مین اس نے توجیہ کی ہے کہ "کمزور کیون غالب رہتے ہین" اور "مریضون اور کمزورون مین عقل زیادہ ہوتی ہے .... اور یہ زیادہ کینہ پرور اور دلچسپ ہوتے ہین، .... عورت نے ہمیشہ انحطاط پذیر اصناف، مثلاً پادریون کیساتھ ملکر "طاقتورون" "زبردستون" یا بالفاظ دیگر مردون کے خلاف سازش کی ہے .... طاقتور قومین جنگ، طاقت کی حرص، اور اولوالعزمی کے ذریعے سے ایک دوسری کو تباہ کرتی ہین، .... ان کا وجود بہت گران پڑتا ہے، اور تمام بڑے بڑے زمانون کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، طاقتور بہرکیف اوسطاً کم وزن کے مقابلے مین کمزور تر، کم مضبوط ارادون والے اور زیادہ لغو ہوتے ہین، یہ فضول خرچ قومین ہین" ان تمام جملون مین عیاری یا طاقتِ عقل، طاقت کے تصور مین شامل معلوم ہوتی ہے،

ل نٹشے نے اپنے "ارادۂ طاقت" (Will to Power) کو "تنازع للبقا" ([illegible]) کے مقابلے پر کھڑا کیا ہے، اس نے طبعی انتخاب کو غلط سمجھا ہے، اور اد ارتقا کے ساتھ خلط ملط کیا ہے، یہ اہم واقعہ اس کی سمجھ مین نہ آیا کہ جسمانی ساخت کا "انحطاط" حیاتیاتی نقطۂ نظر سے بہتر مطابقت کا موجب ہو سکتا ہے، (مصنف)

جس صفائی اور کھرے پن سے نٹشے نے اعتراف کیا ہے کہ "طاقت ور" واقعۃً کمزور ہوتے ہین، اوس نے طاقتور انسان کے عقیدے کی نٹشے کی وکالت مین بظاہر کچھ جان نہین چھوڑی، لیکن نٹشے نے اپنی تصنیف "Will to Power" خود اپنے آپ شائع نہین کی، بہرحال یہان ہمکو "طاقت" کے وسیع تر زیادہ سائنٹفک اور ڈاروینی تصور سے نٹشے کی اصلاح کرنی چاہیے، اس لحاظ سے ہر وہ صفت "طاقت" مین شمار کی جانی چاہیے، جو بقا مین واقعۃً مدد دے، یہان تک کہ وہ دون ہمتی اور حماقت بھی "طاقت" مین شامل ہے، جس کی وجہ سے ایک اژدحام کسی قابل فرد کی قیادت کو قبول کر لیتا ہے، لیکن اس صورت مین اخلاقی صفات کو "طاقت" کی ترکیب سے کیونکر خارج کیا جا سکتا ہے، کیا ہر اخلاقی نظام مین مسلمہ قیمتین زیادہ تر وہ نہین ہوتین، جو عمرانی خوشحالی کی طرف مؤدی ہوتی ہین؟ کیا افراد سے ہر جگہ یہ مطالبہ نہین کیا جاتا کہ وہ اپنی حاکمانہ جبلتون کو عمرانی تعاون کی ضروریات کے قدمون مین ڈال دین؟ کیا نظام ترتیب اور ضبطِ نفس اجتماعی عمل کے لئے ناگزیر نہین؟ حیوانات کی دنیا مین بھی بڑے بڑے شکاری جانور تنہا زندگی بسر کرتے ہین، اور اصولاً وہ دوسرے جانورون کے غول کا مقابلہ نہین کر سکتے، فوق الانسان کے ایک جم غفیر سے بھی ڈاکوؤن کا جتھا نہین بنتا، ڈاکوؤن کا ایک جتھا کسی سلطنت کو فتح نہین کر سکتا، اور تاریخ بتاتی ہے کہ فتح مند سپاہیون کے غول مفتوحہ تہذیبون اور تمدنون مین سے اسی طرح غائب ہو جاتے ہین، جس طرح صحرا مین سے برف، اور جب یونانی "آقایانہ اخلاقیت" ٹھوس صورت مین اپنا اظہار کرتی ہے تو یہ عظیم الشان روح والے انسان کی اس مضحکہ خیز تصویر پر ختم ہوتی ہے، جو ارسطو نے کھینچی ہے، "اس عظیم الشان روح والے انسان" کا "مضبوط بنا پر مبنی احترام ذات" ہمین خود نمائی اور عمرانی محالیت، دونون کا نمونہ معلوم ہوتا ہے، عمرانی اور اجتماعی حالات مین غرور و تکبر کے مقابلے مین مسیحی عجز و انکسار بقا کی طرف زیادہ مؤدی ہوتا ہے، یعنی یہ کہ "غلام" کی تمینات دنیا کو فتح کرتی ہین،

(باقی)

تلخیص و تبصرہ

یورپ کے جدید سیاسی نظام میں عورت کی حیثیت

یورپ کو اپنی نسوانی حریت نوازی پر بڑا ناز تھا، اور اس باب میں وہ ہمیشہ سے مشرق کو مطعون کرتا چلا آرہا ہے، لیکن ادھر چند برسوں سے یورپ کے جدید سیاسی نظام نے خود یورپ میں عورتوں کو جس درجہ پر پہنچا دیا ہے اس کا اندازہ ہیبرٹ جرنل (Hibbert Journal) کے اس اقتباس سے ہوگا،

فاسزم اور نسوانی آزادی دو متضاد چیزیں ہیں، فاسزم عملاً اور اصولاً قوت کی حکومت ہے، جس نظام میں عقل، انصاف اور انسانیت کے بجائے فوجی دستوں اور مادی دولت و ثروت کی قوت کی حکومت ہو وہاں نسوانی تحریک کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے، عورتوں میں برداشت کی قوت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو لیکن وہ جسمانی قوت کے لحاظ سے مردوں کے مقابلہ میں ہمیشہ فروتر رہینگی، وہ میدانِ جنگ میں صف آرا نہیں ہو سکتیں، پھر بچوں کی پرورش کے تفکرات اور وراثت کے یورپین قوانین کے سبب سے مادی دولت کا حصول بھی ان کے بس میں نہیں،

یورپ میں عورتوں میں سیاسی رائے، تعلیم، پیشوں کی ملازمت اور شادی کے بعد آزاد رہنے کے حقوق کی تحریک جمہوریت کے غلغلہ کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی، چنانچہ میری دول اسٹون کرافٹ نے عورتوں کی آزادی کا علم اس وقت اٹھایا تھا، جب یورپ انقلابِ فرانس کے تخیلات پر بحث کر رہا تھا، اگرچہ وہ انگلستان کی رہنے والی تھی لیکن صحیح معنوں میں "شورشِ فرانس کی بیٹی" تھی، اس کے بعد مختلف

عورتوں نے نسوانی آزادی کی علمبرداری کی لیکن اس کا اصلی دور گلیڈاسٹون کے زمانہ میں شروع ہوا، جب سے عورتوں پر سے قانونی، تعلیمی، سیاسی اور معاشرتی پابندیاں دور ہونے لگیں، درمیان میں انیسویں صدی کے ختم میں یہ بڑھتی ہوئی تحریک کچھ رک گئی تھی لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں اعتدال پسندوں کی از سرِ نو تشکیل اور مزدور جماعت کی تکوین سے یہ تحریک پھر شروع ہوئی، اور جنگِ عظیم کے اختتام پر بالغ مردوں کے ساتھ بالغ عورتوں کو بھی سیاسی رائے کا حق دیا گیا، جو جمہوریت کی خود مختار حکومت کی فتح کی دلیل تھی،

لیکن فاسزم اس قسم کی فتح کی سخت مخالف ہے، وہ ہر قسم کے جمہوری حقوق سے انکار کرتی ہے، وہ انقلابِ فرانس کے تمام تخیلات اور نصب العین کو نظر انداز کر دینا چاہتی ہے، وہ انقلابی اور جمہوری تحریکوں کو فنا کرنے کی کوشش کرتی ہے، وہ ایک مطلق العنان حاکم کی قائل ہے جس کا مدار قوت پر ہو، وہ صنعت و حرفت، سیاست و مذہب اور قوانین وغیرہ جملہ امور میں محض ایک جماعت اور صرف ایک رائے چاہتی ہے جس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کریں، وہ قوت اور سپاہیوں کے زور پر حکومت کرنا چاہتی ہے، اسی لئے وہ حکومت میں عورتوں کی مداخلت مطلق نہیں پسند کرتی، اور عورتوں کو مردوں کے حکم کے تابع رکھنا چاہتی ہے، وہ علی الاعلان کہتی ہے کہ فاسزم میں عورتوں کا حصہ صرف جنگجو آدمی پیدا کرنا تھکے ہوئے سپاہیوں کی خدمت کرنا اور ان کے لئے سامانِ تفریح بننا ہے،

مسولینی نے ایک بار گفتگو میں کہا کہ "عورتوں پر اطاعت کرنا فرض ہے، میں امورِ سلطنت میں نسوانی تحریک کا مخالف ہوں، اگر میں عورتوں کو رائے کا حق دے دوں تو لوگ مجھ پر ہنسیں گے، ہماری جیسی سلطنت میں انھیں اپنے کو اہمیت نہ دینی چاہئے، تم جانتے ہو کہ اینگلو سیکسن کا خاتمہ کس طرح ہوگا؟ عورتوں کی حکمرانی کے ذریعہ سے" اسلاف میں مجھکو ایک ہی شخص سے دلچسپی ہوئی، یہ وہ شخص ہے، جس نے اپنی بیوی کو اسلئے قتل کر دیا کہ وہ وفا شعار نہ تھی، وہ اس کے سینہ میں دو چھریاں بھونک کر فرار ہو گیا، عورتوں کیساتھ روما کے لوگوں کا طرزِ عمل رہا ہے، اور میں انھیں کا خلف ہوں"۔

فاسزم کی جماعت میں کوئی عورت رکن نہیں ہے، اس میں شک نہیں کہ عورتوں کی بھی فاسزم کی جماعتیں ہیں، لیکن یہ جماعتیں محض کیتھولک گرجاؤں کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کی خاطر قائم کی گئی ہیں، کیونکہ مذہبی سرگرمیوں کا اظہار عورتوں ہی کے ذریعہ سے خوب ہو سکتا ہے، مگران جماعتوں کی مشغولیتیں بالکل محدود ہیں اور وہ مردوں کی زیرِ نگرانی کام کرتی ہیں، ان کی ناظمہ اپنی جماعت کے اراکین سے نہیں بلکہ مرد حکام سے احکام حاصل کرتی ہے، یہ جماعتیں کسی سیاسی کام میں دخیل نہیں ہو سکتیں، بلکہ صرف انہی کاموں میں حصہ لیتی ہیں، جو انسانی ہمدردی سے تعلق رکھتے ہیں، انھیں خاص طور سے فاسزم کے ان افراد کے پسماندگاں کے مصائب کو دور کرنے کی تاکید کیجاتی ہے، جنھوں نے حکومت کی خاطر جانیں گنوائی ہیں،

فاسزم کا ایک قانون یہ ہے کہ کوئی عورت گیارہ برس سے زیادہ عمر والے نوجوانوں کو ایسی تعلیم نہیں دے سکتی جو ان کی سیرت کی نشوونما پر اثر انداز ہو، اسی لئے اسکول اور کالج میں عورتوں کو کوئی جگہ نہیں مل سکتی، ایک بار ایک عورت ایک تھیٹر کی ڈائرکٹر مقرر ہوئی، گو وہ ہر لحاظ سے اس جگہ کے لئے موزوں ثابت ہوئی لیکن فاسزم کے تمام اخبارات نے اس تقرر پر ملامت آمیز مضامین لکھے اور اس کو ڈرامہ کے مشتاقوں اور اطالوی اساتذۂ فن کی اہانت قرار دیا گیا، ایک اخبار نے لکھا کہ "کیا ہمارا انقلاب مردوں کے معاملہ میں اسقدر ناکام ثابت ہوا کہ ایک عورت اٹلی کے سب سے بڑے تھیٹر کی منتظمہ مقرر کی گئی ہے"۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ فاسزم کے ماتحت اٹلی میں عورتوں کی قانونی اور معاشرتی حیثیت کتنی پست ہو گئی ہے، قانوناً ایک عورت مرد سے فروتر ہے، ایک اطالوی اپنے خاندان کی عورتوں کو زدوکوب کر سکتا ہے، بشرطیکہ ان کی ہڈیاں ٹوٹنے نہ پائیں، اور اگر ٹوٹ جائیں تو یہ قصور بھی قابلِ معافی ہے، اور عورتیں بطورِ احتجاج اس کی شکایت نہیں کر سکتیں، اگر زدوکوب سے عاجز آکر کوئی بیوی اپنے شوہر کے گھر سے بھاگ جائے تو پولیس کو حکم ہے کہ وہ اس کا تعاقب کرے، اور مفرور عورت ایک سال کی قید یا ایک ہزار سے دس ہزار اطالوی سکے کے جرمانہ کی مستحق قرار دیجاتی ہے، شوہروں کے لئے اس قسم کی کوئی پابندی نہیں،

وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں، مرد اگر اپنی عزت وناموس کے تحفظ کے لئے اپنی عورتوں مثلاً بیوی، بہن یا بیٹی کو قتل کر دیں تو ان سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ چند اطالوی فوجی افسروں نے اپنی بیویوں کو قتل کر دیا لیکن وہ بدستور اپنے عہدوں پر برقرار رہے،

فاسزم میں عورتوں کا درجہ اسی حد تک قابلِ التفات ہے کہ وہ بہادر اور جنگجو افراد کی تولید کا آلہ ہیں، جو عورتیں چھ، سات، آٹھ، یا توام بچوں کی ماں ہوتی ہیں انھیں نقد انعام دیا جاتا ہے، اس نظام میں اضافۂ آبادی کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ حکومت کے محکموں میں کنوارے اور مجرد مردوں کے مقابلہ میں متاہل اور گھربار رکھنے والوں کو ترجیح دیجاتی ہے، اور حکومت کے ملازمین سے تو جبراً شادی کرائی جاتی ہے،

جرمنی میں ہٹلر کی قومی اشتمالی حکومت میں بھی عورتوں پر اسی قسم کی پابندیاں ہیں، بلکہ ان کی بندشیں تو اور بھی زیادہ سخت ہیں، جرمنی میں یہ خیال سرعت کے ساتھ پھیلتا جاتا ہے، کہ مردوں کو زندگی کا اور عورتوں کو خانگی دھندوں کا ماہر ہونا چاہئے، ایک جرمن اخبار نے ۳۴ء میں لکھا تھا کہ "وہ عورتیں جو اپنی آپ کفیل ہیں مردوں کی خودداری پر نہ صرف اس حیثیت سے کاری ضرب لگاتی ہیں کہ وہ ان کی حریف بن رہی ہیں، بلکہ ان کو اپنے خاندان کے ذریعۂ معاش ہونے کے احساسِ غرور سے بھی محروم کر دینا چاہتی ہیں"

نازی حکومت کے قائم ہوتے ہی عورتیں مرکزی، صوبجاتی پارلیمنٹ اور مقامی مجلس قوانین سے جن میں انھوں نے ۱۹۱۸ء کے انقلاب کے بعد شہریت کے حقوق کی بنا پر کافی جگہیں حاصل کر لی تھیں، نکال دی گئیں، ان کی تنظیم کا شیرازہ منتشر کر دیا گیا، ان کی کارکن خواتین یا اپنا ملک چھوڑ کر بیرونی ممالک میں پناہ گزیں ہو گئیں یا گرفتار کر لی گئیں یا کسی اور کام میں لگا دی گئیں، نازی حکومت کی یہ کھلی ہوئی حکمت عملی ہے کہ عورتیں مقامی مجلسِ مقننہ، ہسپتال، اسکول، کالج اور تمام محکموں سے ہٹا دی جائیں، پینتیس برس سے کم عمر کی عورتیں کسی سرکاری ملازمت کی اُمیدوار نہیں ہو سکتیں، اس عمر کے بعد بھی اگر وہ کسی برسرِ روزگار شخص یا غیر آریائی نسل کے آدمی سے شادی کر لیں تو ان کی ملازمت

کا حق منسوخ ہو جاتا ہے، جون ۳۳ء میں ایک قانون پیش ہوا جس کی رو سے تمام شادی شدہ عورتوں کو اس صورت میں ملازمتوں سے علحدہ کیا جا سکتا تھا، جب ان کے اعلیٰ حکام کو یہ اطمینان ہو جائے کہ ان عورتوں کے پاس زندگی بسر کرنے کے سامان و وسائل موجود ہیں، ان غیر شادی شدہ لڑکیوں کو بھی اس حالت میں علحدہ کرنے کی ہدایت تھی، جب ان کے والد، بھائی یا بہنیں ان کی کفالت کر سکتے ہوں، لیکن قبل اس کے کہ اس قانون کا نفاذ ہو، نازی حکومت نے ہزاروں عورتوں کو مختلف عہدوں سے ہٹا دیا جن پر وہ جمہوریت کے زمانہ سے مامور تھیں، یہودی عورتیں تو خصوصیت کے ساتھ ہر شعبے اور ہر پیشے سے بالکل نکال دی گئی ہیں،

یونیورسٹی میں عورتوں کا داخلہ نہایت ہی محدود ہو گیا ہے، میٹریکولیشن کے امتحان کی پاس شدہ طالبات میں صرف دس فیصدی یونیورسٹی میں داخل ہو سکتی ہیں، ان کو بھی پیشہ کی تعلیم حاصل کرنے کی سخت ممانعت ہے، سال میں صرف ۵، عورتیں طب کی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں، سائنٹفک علوم صرف مردوں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں، معلمی کا پیشہ صرف مردوں کی ماتحتی میں اختیار کر سکتی ہیں، پروشیا کا ایک اخبار لکھتا ہے کہ مرد اساتذہ کا نسوانی حکام سے نفرت کرنا ان کی تندرست جبلت کی دلیل ہے،

وہ عورتیں جو ذمہ دار پیشوں اور صنعت و حرفت کے کاموں میں تھیں اب زمین اور کاشت وغیرہ میں لگا دی گئی ہیں، حکومت تو ایسی عورتوں کو بھی جو ذہنی حیثیت سے نہایت بلند ہیں، ایسے کاموں کے لئے مجبور کرتی ہے، جن کی سختی غلامی کی مترادف ہے، اب ہر جگہ یہی کوشش جاری ہے کہ عورتیں صنعت و حرفت کے کاموں سے ہٹا کر گھر بار، کاشت یا کارخانوں میں لگا دی جائیں، کارخانوں میں بھی ان سے صرف مخصوص کام لئے جاتے ہیں، مثلاً زہریلی گیس اور بارود وغیرہ بنوائی جاتی ہے، اور وہ بھی ایسے تاریک کمروں میں جن میں صرف سرخ اور نیلی روشنی ہوتی ہے، صنعت کے کاموں میں عورتوں کی اجرت مردوں سے ۳۰ فیصدی کم کر دی گئی ہے، ان قیود و شرائط اور سختیوں کے باوجود بھی عورتوں کو

زبردستی کارخانوں سے نکال دینے کا عمل برابر جاری ہے، چنانچہ ہسپتال اور دوسرے اداروں میں جہاں عورتیں کھانا پکانے کا کام کرتی تھیں اب ان کے بجائے باورچیوں سے یہ کام لیا جاتا ہے،

عورتوں کو ملازمتوں سے نکالنے کا ایک اور ذریعہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ حکومت ملازمت پیشہ عورتوں کو شادی کے لئے اس شرط پر پچاس پونڈ قرض دیتی ہے کہ وہ اس وقت تک اپنی ملازمت پر واپس نہیں آسکتیں جب تک کہ ان کے شوہروں کی آمدنی چھ پونڈ پانچ شلنگ ماہوار سے گھٹ نہ جائے یا قرض بالکل ادا نہ ہو جائے، یہ قرض نقد نہیں بلکہ رسید (کوپن) کی صورت میں دیا جاتا ہے، جس سے وہ گھر کے لئے ضروری سامان خریدتی ہیں، یہ قرض آٹھ سال سے کم کی مدت میں ادا نہیں کیا جا سکتا،

بیکار عورتیں کیمپ میں بھیجدی جاتی ہیں، جہاں ان سے صفائی کا کام لیا جاتا ہے، ان کے لئے گھر، اصطبل، اور کھیت میں کام کرنا ضروری ہے، دس یا بارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد ان کے لئے نازی فلسفہ پر لکچر سننا لازمی قرار دیا گیا ہے، وہ کوئی اجرت نہیں پاتیں اور نہ انھیں اچھی غذا دیجاتی ہے، مختصر چھاؤنی اور غلہ کی تنگ کوٹھریوں میں انہیں گھاس پر سلایا جاتا ہے، اور آہنی ضبط و نظم اور شدید سزا کے ساتھ رکھا جاتا ہے، اور ان میں سے کوئی عورت علحدہ کر دیجاتی ہے تو اس کے سرٹیفکٹ میں علحدگی کے اسباب بیان کر دیئے جاتے ہیں، جس سے پھر کہیں وہ کوئی کام نہیں پا سکتی، علحدگی کے بعد اگر اس کے والدین اس کو اپنے دامنِ عاطفت میں لے لیں تو وہ بھی بے کار ہونے کے بعد بے روزگاری کے تمام حقوق سے محروم کر دیئے جاتے ہیں، کارخانوں، دفتروں، یونیورسٹیوں اور دوسرے محکموں سے نکالی ہوئی کثیر التعداد عورتوں سے کیچڑ سے بھرے ہوئے کھیتوں میں مسلسل دس بارہ گھنٹے کام لیا جاتا ہے، جہاں کیمپ میں پہلے صرف غیر شادی شدہ عورتوں سے کام لیا جاتا تھا، اب شادی شدہ عورتوں کو بھی مجبور کیا جاتا ہے، اور ان کے بچے یتیم خانوں میں بھیجدیئے جاتے ہیں،

سترہ سے بیس برس تک کی لڑکیوں کے لئے کام کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے، جس کی مشقت فوجی خدمات سے کم صبر آزما نہیں ہوتی،

نازی حکومت سے اختلاف رکھنے والی عورتوں کے ساتھ جو ظلم اور تشدد برتا جاتا ہے وہ نہایت روح فرسا اور نفرت انگیز ہے، ایک اشتراکی جرمن خاتون میریا جانکوسکی کو جس کی عمر ۴۹ برس تھی، اسکے خیالات کے جرم میں بیس مسلح آدمیوں نے گھر کے اندر گھس کر گرفتار کر لیا اور اسکو جمہوریت کا علم دکھا کر گندے الفاظ میں اسے یاد کرنے کی فہمایش کی، خاتون نے انکار کر دیا، اس کے انکار پر آدمیوں نے اسے بالکل برہنہ کر کے بیدوں اور چھڑیوں سے مارنا شروع کیا، تنو ضربیں لگی ہونگی کہ اس کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے، اس پر بھی ان سنگدلوں کی تشفی نہیں ہوئی، اور انھوں نے اس کے منھ پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ بے حال ہو کر زمین پر گر گئی، لیکن جب تک وہ اشتمالیت سے انکار پر آمادہ نہیں ہوئی اس وقت تک اسکو نہیں چھوڑا، انکار کرنے کے بعد وہ ہسپتال لائی گئی، لیکن زخموں سے جانبر نہ ہوسکی،

اتفاق سے ایک مرتبہ ہیٹی سویس نامی ایک خاتون ایک یہودی کے ساتھ دیکھ لی گئی، اس جرم کی اس کو یہ سزا دی گئی، کہ اس کا سر مونڈ کر سڑکوں پر اس کی تشہیر کی گئی، اس کے گلے میں یہ تختی آویزاں تھی کہ "میں نے اپنے کو ایک یہودی کے حوالہ کیا تھا"، ایسی ذلت آمیز اور دلشکن سزا سے اس کا دماغی توازن بالکل بگڑ گیا،

اس قبیل کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اٹلی اور جرمنی کی مطلق العنان حکومت میں عورتوں کی محکومیت اس زمانہ سے بھی زیادہ سخت ہو گئی ہے، جس سے انھوں نے ایک صدی کی مصیبت خیز کوششوں کے بعد اپنے کو آزاد کیا تھا،

"ص ع"

اخبارِ علمیہ

آیندہ جنگ میں زہریلی گیس سے بچنے کی تدبیریں

۱۹۲۵ء میں دنیا کی قوموں نے ایک معاہدہ پر دستخط کر کے زہریلی گیسوں کا استعمال جنگ کے زمانہ میں ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دے دیا تھا، لیکن آج وہی قومیں نہایت سرگرمی کے ساتھ گیس کے ایک متوقع حملہ سے بچنے کی تدبیریں کر رہی ہیں جو نہ صرف فوجوں پر ہونے والا ہے، بلکہ غیر فوجی آبادی بھی اس کی زد میں آئے گی، حکومتیں لوگوں کے خوف اور گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے ایسے تہ خانے تعمیر کرا رہی ہیں، جن میں باہر کی ہوا داخل نہیں ہو سکتی، نیز باضابطہ طور پر تمام باشندوں حتیٰ کہ بچوں اور جانوروں کو بھی گیس کی نقابوں کا استعمال سکھایا جا رہا ہے، گذشتہ جولائی ہی میں برطانیہ نے اعلان کیا کہ دو سال کے اندر وہ اپنی پوری آبادی کے لئے گیس کی نقابیں فراہم کر دے گی، جن کے استعمال سے گیس کے حملے بے اثر رہیں گے، چنانچہ ایسی نقابیں ایک بڑی تعداد میں تیار بھی کر لی گئی ہیں، ان کا وزن صرف ڈیڑھ پونڈ ہے اور یہ اس قدر چھوٹی ہیں کہ آسانی سے کوٹ کی جیب میں رکھی جا سکتی ہیں، حکومت کی نگرانی میں یہ نقابیں غیر سرکاری انگریزی کارخانوں میں تیار ہونگی، ان کی قیمت دو شلنگ ہوگی، دیکھنے میں یہ نقابیں نہایت ہیبت ناک معلوم ہوتی ہیں، شیشہ کی بڑی بڑی عینک کے علاوہ ان میں ایک موٹی اور لچیلی نلکی بھی ہوتی ہے جو بالکل ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹکی رہتی ہے، یہ کیمیائی طور پر اس طرح تیار کی گئی ہیں کہ باہر کی ہوا تمام زہریلے مادہ سے صاف ہو کر اندر جاتی ہے، بچوں کے لئے ایسی بند گاڑیاں تیار کی گئی ہیں جن کے اندر صاف ہوا بھر دی جایا کرے گی، اور باہر کی ہوا کا ان پر کوئی اثر نہ ہوگا،

کوشش کی جارہی ہے کہ بچوں کے لئے بھی نقابیں بنا دی جائیں، برطانیہ میں گیس کے حملہ کا خوف لوگوں پر اس قدر طاری ہے کہ ملک میں ہر جگہ ان نقابوں کی مشق کرائی جارہی ہے، برطانیہ کے علاوہ اور کسی ملک میں تمام باشندوں کے لئے نقابوں کا استعمال تجویز نہیں کیا گیا ہے، فرانس نے صرف سپاہیوں، نرسوں، اور ان غیر فوجی باشندوں کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی، جو لڑائی کے لئے تیار کئے جاتے تھے، عام لوگوں کے لئے حکومت نے محفوظ تہ خانوں کا انتظام کیا تھا، ان میں سے ایک میں جو پیرس میں واقع ہے، اس وقت آٹھ ہزار آدمی پناہ گزیں ہو سکتے ہیں، فرانسیسی موجدوں نے نقابوں کی موجودہ ہیبت ناک شکل میں اصلاح کی کوشش بھی کی ہے، ایک شخص نے ایک قسم کا بکس بنایا ہے جس میں مائیں حملہ کے دوران میں اپنے بچوں کو محفوظ طور پر رکھ سکتی ہیں، ایک دوسرے موجد نے غبارہ کی شکل کی ایک چیز تیار کی ہے، جس میں داخل ہو کر انسان زہریلی گیس سے محفوظ رہ سکتا ہے، جرمنی میں نقابوں کے بجائے ایسے تہ خانوں کی تعمیر ہو رہی ہے، جنھیں گیس داخل نہ ہو سکے، اور حکومت کی طرف سے مرکزی مقامات پر فولاد کے تہ خانے بنوا دیئے گئے ہیں، تاہم وہاں بھی بعض لوگوں نے اپنے کتوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نقابیں خرید لی ہیں، امریکہ میں اس وقت صرف فوج کے لئے نقابیں خریدی جاتی ہیں، جن کی قیمت ۵۰ء۱۱ ڈالر ہے، لیکن اگر ضرورت پیش آئی تو امریکن کارخانے عام باشندوں کیلئے لاکھوں نقابیں ۵ ڈالر فی نقاب کے حساب سے تیار کر دینگے،

اگر فوجوں میں اس وقت جو نقابیں مستعمل ہیں وہ ہر قسم کی زہریلی گیسوں کے لئے بالکل کافی ہیں، ماہرین کا بیان ہے کہ گیسوں کا خوف جو عام طور پر اس درجہ طاری ہے، غلط اطلاع پر مبنی ہے، جنگ عظیم کے دوران میں بھی جب ۷۰،۷۵۲ امریکن گیس سے زخمی ہوئے تھے، میدانِ جنگ میں گیس سے مرنے والوں کی تعداد صرف ۲۰۰ تھی اور ہسپتالوں میں کل (۱۲۲۱)۔ کسی بڑے شہر کو گیس سے برباد کر دینے کے لئے سب سے اہم سوال گیس کی مقدار اور مصارف کا ہے، یعنی کوئی دشمن کسی بڑے

شہر پر بیک وقت کافی مقدار میں گیس برسا بھی سکتا ہے یا نہیں، ماہرین اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں، چنانچہ جنگ عظیم میں ۳۵۰۰۰۰ آدمی جو گیس سے زخمی ہوئے ان میں ہلاک ہونے والوں کا اوسط صرف ۲ء۵ فی صدی تھا، یعنی ایک آدمی کو ہلاک کرنے کے لئے ڈیڑھ ٹن گیس صرف ہوئی، اس حساب سے لندن کے ۸۲۰۳۹۴۲ مردوں، عورتوں، اور بچوں کو ہلاک کرنے کے لئے ۱۲۳۰۵۹۱۳ ٹن گیس کی ضرورت ہوگی جسے ۶۰۰۰۰۰ ہوائی جہازوں سے برسانا پڑیگا،

ایک نہایت قدیم شہر کا انکشاف

شاہ حمورابی (Hammurabi) سنہ ۲۰۲۴ قبل مسیح میں بابل میں حکومت کرتا تھا، اور اس کا خیال تھا کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے، لیکن اسی زمانہ میں کرۂ ارض کی دوسری جانب امریکہ کے علاقہ نبراسکا (Nebraska) میں ایک اور شہر بھی آباد تھا جو بابل سے کئی گنا بڑا تھا، یہ شہر تین میل لمبا اور نصف میل چوڑا تھا، اس کی عمارتوں پر مٹی کا پلاسٹر تھا، اس کے میدانوں میں غلہ اور سیم کے کھیت تھے، جن کی آبیاری پونکا کریک (Ponca Creek) نامی ایک قریب کے چشمہ سے ہوتی تھی، اسکے باشندے مٹی کے برتن، پتھر کے چاقو اور سیپ کے زیورات استعمال کرتے تھے، وہ اپنے کھانے کی چیزیں زمین میں چھوٹے چھوٹے گڈھے کھود کر یا مٹی کے گھڑوں میں رکھتے تھے، تین ہزار سال ہوئے، اس علاقہ میں زبردست خشک سالی آئی تھی، اور لوگوں نے اس شہر کی سکونت ترک کر دی تھی، اس کے بعد ایک طوفان ایسا آیا کہ پورا شہر ریگ کی ایک موٹی چادر کے نیچے چھپ گیا، اور تین ہزار برس تک تاریخ کی نظروں سے پوشیدہ رہا، مگر حال میں ایک ویسا ہی طوفان پھر آیا جس نے اس چادر کے ایک حصہ کو چاک کر دیا، اور شہر کے بعض آثار دکھائی دینے لگے، چنانچہ گذشتہ جولائی میں نبراسکا یونیورسٹی کے ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر بل (Dr. Earl H. Bell) نے ایک جماعت کے ساتھ اس مقام کی کھدائی شروع کر دی اور چند ہی دنوں میں بہت سی چیزیں برآمد کیں، کچھ پکی ہوئی کھانے کی چیزیں بھی ملیں جو کسی قدر جل جانے کی وجہ سے اب تک

محفوظ تھیں، گھڑوں میں غلہ وغیرہ کی قسم سے جو چیزیں رکھی ہوئی تھیں وہ بھی درست حالت میں پائی گئیں، کوڑ کرکٹ کے ڈھیروں سے جانوروں کی ہڈیاں اس کثرت سے نکلیں کہ ماہرین اثریات کو ان کے مطالعہ کے لئے کافی وقت نہیں ملا، ہڈیاں زیادہ تر جنگلی بھینسوں اور بارہ سنگھوں کی ہیں، لیکن سب سے زیادہ اہم چیز جو ڈاکٹر ڈل نے اس خطہ میں پائی ہے وہ وہاں کی خاک کے مخصوص ذرات ہیں، ڈاکٹر موصوف کو امید ہے کہ ان ذرات کے مطالعہ سے یہ صحیح طور پر معلوم ہوجائے گا کہ یہ مدفون شہر کب آباد تھا، اس کی آب و ہوا کیسی تھی، اور اس کے باشندے اسے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے،

ایک عجیب و غریب درخت

افریقہ کے مشرقی ساحل پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کو پراسلن (Praslin) کہتے ہیں، اس جزیرہ میں ایک ایسا درخت ہوتا ہے جو دنیا کے کسی اور حصہ میں نہیں پایا جاتا، یہ درخت ایک خاص قسم کے ناریل کا ہوتا ہے جو کوکوڈی میر (Coco-de-mer) کے نام سے مشہور ہے، اس ناریل کے اندر دو بڑے پھل ہوتے ہیں جو آپس میں جڑے رہتے ہیں، اور ان پھلوں کے اندر بیضاوی شکل کا گودا ہوتا ہے جو ایک باریک پردے میں لپٹا ہوتا ہے، یہ گودا بالکل شفاف اور سفیدی مائل یا ہلکے گلابی رنگ کا ہوتا ہے، ذائقہ میں لذیذ اور اثر کے اعتبار سے مقوی اور نشاط انگیز ہوتا ہے، جزیرہ والوں کی ضرورت سے جو پھل فاضل ہوتے ہیں وہ مشرق میں بھیج دیئے جاتے ہیں جہاں ان سے اعادۂ شباب کی دوائیں تیار کیجاتی ہیں، اس عجیب و غریب پھل کے درخت بہت دنوں میں بڑھتے ہیں، ساٹھ سال کے بعد ان میں پھل آتے ہیں، اور پھلوں کے پکنے میں سات برس لگ جاتے ہیں، بہتیرے درخت سو فٹ اونچے ہیں، بعض دو سو فٹ بلند بھی ہیں، اس جزیرہ میں یہ درخت پانچ سو برس سے لگے ہوئے ہیں، کچھ ہزار برس کے بھی ہیں،

"ع ز"

ادبیات

شغلِ تکفیر

علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک پرانی نظم،

بعض پرانے نوادر ایسے ہوتے ہیں کہ امتدادِ زمانہ کے باوجود ہر دور کے حالات انھیں نیا بنا دیتے ہیں، انہی میں علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک پرانی نظم ہے جو ان کے مجموعۂ کلام میں چھپ چکی تھی، یہ گویا موجودہ "دورِ تکفیر" میں خود مصنف کی زبان سے اس کی تکفیر کی معذرت و توجیہ ہے،

اک مولوی صاحب سے کہا میں نے کہ "کیا آپ — کچھ حالتِ یورپ سے خبردار نہیں ہیں
آمادۂ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں — ہر چند ابھی مائلِ اظہار نہیں ہیں
تقلید کے پھندوں سے ہوجاتے ہیں آزاد — وہ لوگ بھی جو داخلِ احرار نہیں ہیں
جو نام سے اسلام کے ہوجاتے تھے برہم — ان میں بھی تعصب کے وہ آثار نہیں ہیں
افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا — یا ہیں تو بقول آپکے دیندار نہیں ہیں
کیا آپ کے زمرہ میں کسی کو نہیں یہ درد — کیا آپ بھی اسکے لئے تیار نہیں ہیں"
جھلا کے کہا یہ کہ "یہ کیا سوءِ ادب ہے — کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر

بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں"

روحِ زندگی

از جناب پروفیسر اکبر منیر صاحب

اٹھو خوابِ شبانہ سے جوانو! — افق خونِ شفق سے لالہ گوں ہے

ہے سیلِ شیطنت تہذیبِ مغرب — فسوں اندر فسوں اندر فسوں ہے

بڑھے آتے ہیں فتنے فوج در فوج — یہ ہنگامہ قیامت سے فزوں ہے

ہے ضربِ تیشۂ فرہاد درکار — کہ رستے میں تمہارے "بیستوں" ہے

ہے روحِ زندگی عشقِ جنوں خیز — پیامِ مرگ عقلِ ذوفنوں ہے

کرو پیدا وہ عشقِ تند و بے باک — جو مثلِ تیغِ بُراں غرقِ خوں ہے

نظر جس کی ہے سوئے عرشِ اعظم — قدم میں جس کے چرخِ نیلگوں ہے

اسی سے ہے بدن میں روحِ رقصاں — یہ پُر نغمہ مثالِ ارغنوں ہے

اسی سے زندگی کی شمع روشن — یہی عقل و خرد کا رھنموں ہے

ہے اس کے بال و پر میں زورِ جبریلؑ — اسی شمشیر سے شیطاں زبوں ہے

یہی دیتا ہے نورِ علم و عرفاں — یہی انسان کی شمعِ دروں ہے

منور اس سے ہیں روح و دل و جاں — مسخر گردشِ گردونِ دوں ہے

اسی آتش سے ہے انساں سرافراز

جو یہ بجھ جائے تو وہ سرنگوں ہے،

نوائے فراق

از

جناب پروفیسر فراق الٰہ آباد یونیورسٹی

وفورِ شوق کو اندازِ حسن راہ تو دے — یہ برقِ جلوہ تری فرصتِ نگاہ تو دے

رہیگا کھل کے کبھی رازِ ہوش و غفلت بھی — پتہ کچھ اپنا سیہ مستیِ نگاہ تو دے

وصالِ حسن سہی عالمِ شہود سہی — نشاں مرا بھی کہیں تیری جلوہ گاہ تو دے

غم و خوشی میں ترے حسن بے پناہ کی خیر — خراب حال دلوں کو کہیں پناہ تو دے

دل اپنا بیٹھ چلا جب تو ذکرِ ساحل کیا — یہ ناؤ ڈوب کے دریائے غم کی تھاہ تو دے

کہیں نہیں ترے گم گشتگانِ عشق مگر — ہوائے عالمِ ہو دل کی سرد آہ تو دے

حجابِ حسن کو بے باک بھی بنا لیں گے — پتہ کچھ اپنا تری شرمگیں نگاہ تو دے

ہر اک کے ہوش کا کھل جائیگا بھرم ساقی — کچھ اذنِ بادہ کشی نرگسِ سیاہ تو دے

نہیں ہے چین جو قسمت میں اے غمِ جاناں — کشاکشِ غمِ دنیا سے کچھ پناہ تو دے

علاجِ خوبیِ تقدیرِ عشق کیا ہمدم — وہ دل سے عہدِ وفا باندھ کر نباہ تو دے

فنا کی موج کا سر سے گذر مبارک ہو — اترنے والوں کو دریائے عشق تھاہ تو دے

فراق گم رہیِ وصل و ہجر سے بچ کر

تو اپنے دل کو کبھی اپنے دل میں راہ تو دے

باب التقریظ والانتقاد

ہندوستانی زبان کے رسالون کے سالنامے اور خاص نمبر

رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر نکالنے کا مذاق اتنا بڑھتا جاتا ہے، کہ کوئی ششماہی ایسی نہیں گذرتی جس مین چند اچھے سالنامے نہ نکلتے ہون، ۳۶ء کی گذشتہ ششماہی کے سالنامون اور خاص نمبرون میں حسب ذیل قابل ذکر ہین،

شاہکار کا سالانہ نمبر، مرتبہ پروفیسر تاجور صاحب حجم ۱۶۰ صفحات تقطیع ۲۶×۲۰/۴ کاغذ سپید، کتابت وطباعت روشن، قیمت عہ، علاوہ محصولڈاک سالانہ قیمت چھ روپیہ، پتہ دفتر شاہکار، کوٹھی مجوب شاہ، احاطہ کاتو چراغ دین روڈ مزنگ لاہور،

تاجور صاحب کو سالنامہ نکالنے کا خاص مذاق ہے، شاہکار ۳۶ء کا سالانہ نمبر انھون نے بڑے اہتمام سے نکالا ہے، مضامین کے تنوع انتخاب اور ترتیب سے حسنِ مذاق اور سلیقہ مندی نمایان ہے، ہندوستان کے ممتاز اہلِ قلم کے مضامین، اور مشاہیر شعراء کے کلام سے سالنامہ مزین ہے، مضامین کے انتخاب میں ہر مذاق کا لحاظ رکھا گیا ہے، سنجیدہ، علمی تفریحی اور افسانے، ہر رنگ کے مضامین ہیں، افسانون میں خواجہ غلام السیدین کا افسانہ قانونی مجرم ایثار و قربانی کا بہترین سبق ہے، مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا "سفرنامہ" نہایت دلچسپ اور ان کے خاص رنگ ظرافت کی چاشنی، اور شگفتہ نگاری کا مرقع ہے، خصوصاً یورپ کی "علمی اجوبہ پرستی" کا نہایت لطیف اور ظریفانہ رنگ میں خاکہ اڑایا گیا ہے، سلطان حیدر صاحب جوش کا "منظر العجائب" ظریفانہ رنگ میں، اور "گیتی آرا" اچھے اور دلچسپ افسانے ہین،

سنجیدہ مضامین مین "اردو کے ماخذ کے متعلق بعض اہم غلط فہمیان" ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور قادری "جدید اردو شاعری کی خصوصیات" پروفیسر اعجاز صاحب "محاورہ میں تبدیلی" حکیم عیش امروہوی "عطار کی غزلیات" سید حسن صاحب برنی مفید اور لائق ذکر مضامین ہین، حکیم صاحب کا مضمون تشنہ اور مزید وضاحت کا طالب ہے، ابو العلا صاحب ناطق کی کوشش کوہ کندن وکاہ برآوردن سے کم نہیں، نظم کا حصہ بھی خوشرنگ ہے، حسرت موہانی فانی، جلیل، آرزو، جوش، سیماب وغیرہ مشاہیر شعراء کی غزلون سے رسالہ مرصع ہے، ظاہری حسن کے لئے چند تصاویر زیب رسالہ ہین،

عالمگیر کا سالنامہ، مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب حجم ۱۰۲ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۴ کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، سالانہ قیمت للعہ، علاوہ محصولڈاک، پتہ دفتر رسالہ عالمگیر، بازار سید مٹھا لاہور،

عالمگیر نہایت پابندی کیساتھ اپنا سالانہ نمبر نکالتا ہے، چنانچہ حسب معمول اس نے ۳۶ء کا سالنامہ بھی اہتمام کے ساتھ نکالا ہے، اور اپنے ناظرین کی دلچسپی کے لئے رنگ برنگ کے مضامین فراہم کئے ہین، بڑا حصہ افسانون کا ہے، دوسری زبانون کے ترجمہ شدہ افسانے زیادہ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہین، "ملکہ جنوب" مترجمہ قاضی محمد شفیع صاحب سامی عہد عتیق کی یادگار ہے، "بوڑھا غازی"، مرزا عاشق بیگ صاحب جو فارسی ڈرامے کا ترجمہ ہے سرفروشی و وطن پرستی اور" درس۔ "یگانگی" اتحاد قومی کا بہترین سبق ہے، "سندری اور شنکر" کسی بنگالی افسانے کا ترجمہ یا اس سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، اور ان لوگون کے لئے عبرت آموز ہے، جو ذات پاک کی بیجا بندشون مین جکڑے ہوئے ہین، خواجہ عبد الرؤف عشرت نے بھی اپنے مخصوص رنگ مین قدیم لکھنؤ کے بعض مناظر دکھائے ہین،

سنجیدہ مضامین مین "شاہان سلف کی ادب نوازی"، "ولی دکنی کا نظریہ محبت"، "مہدی سودائی" "اردو غزل کا جدید اسکول"، لائق مطالعہ ہین، نثر کے مقابلہ مین نظم کا وزن ذرا ہلکا ہے، مجموعی حیثیت سے سالنامہ کامیاب ہے،

ساقی کا افسانہ نمبر، مرتبہ شاہد احمد صاحب بی اے، حجم ۲۰۰ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰
کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، سالانہ قیمت للعہ پتہ دفتر ساقی دہلی،

ساقی دہلی کے اچھے رسائل مین ہے، اس کے صفحات پر اکثر وہان کے ممتاز ادیب واہل قلم نظر آتے
ہین، شاہد صاحب سال مین ساقی کے کئی خاص نمبر نکالتے ہین، جولائی ۳۶ء کا خاص نمبر اونھون نے
افسانہ نمبر کے نام سے نکالا ہے، افسوس ہے کہ ہر مفید شے کی طرح آج کل افسانون کا حقیقی مقصد بھی
فوت ہو کر رہ گیا ہے، جس شے سے مفید نتائج پیدا کئے جا سکتے تھے وہ محض حسن وعشق کی کہانی بن گئی ہے،
منشی پریم چند کا جو ہندوستان کے نامور افسانہ نویس ہین کوئی افسانہ کسی مفید نتیجہ اور مقصد سے خالی نہین
ہوتا، لیکن ہمارے نوجوان ادیبون کے افسانون کا عموماً بے معنی افسانوی "رومانیت" کے سوا کچھ مقصد
نہین ہوتا، اور خود اڈیٹر ساقی کا قلم خصوصیت کے ساتھ اس باب مین زیادہ غیر معتدل واقع ہوا ہے، اسکی
تازہ مثال ان کا افسانہ "دیور" ہے، جس کو اونھون نے غالباً اپنے ماحول کی فضا سے متاثر ہو کر ارقام
فرمایا ہے، کیا وہ یہ رنگین کھیل کسی شریف گھرانے مین پسند کرین گے؟

اس پہلو کو قطع نظر کرکے محض افسانون کی حیثیت سے یہ نمبر نہایت کامیاب ہے، بیشتر افسانے
دلچسپ اور بعض مفید اور نتیجہ خیز بھی ہین، ان مین مشہور فرانسیسی اہل قلم گستیو فلابیر کا افسانہ "ہیرودیاس"
جسے مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے شگفتہ نگار قلم نے ہندوستانی زبان کا جامہ پہنایا ہے، خاص
طور سے لائق ذکر ہے، جو قدیم سامی تاریخ اور روایات کا حامل ہے، اس کے علاوہ "ایثار" ل احمد
صاحب بی اے کی کہانی "پریم پجاری" "لندن کی ایک رات" سجاد ظہیر صاحب "نجومی کی وصیت" وغیرہ
دلچسپ افسانے ہین، پروفیسر برلاس کے "شذرات" "مین ہندوستانی ہون" "ان شایستہ" ہندوستانیون
کے لئے جو بیرونی ممالک مین اپنے "اعمال حسنہ" سے ہندوستان کا نام روشن کرتے ہین عبرت آموز ہین

ادب لطیف افسانہ نمبر، مرتبہ چودھری برکت علی صاحب و مرزا ادیب صاحب

حجم ۱۰۰ صفحات کاغذ سپید کتابت وطباعت صاف وروشن قیمت ۱۲ر سالانہ قیمت تین روپے،
پتہ:- پنجاب بکڈپو لاہور،

ادب لطیف کی عمر ابھی کوئی ایسی بڑی نہین، لیکن اتنے ہی دنون مین اس نے خاصی ترقی کر لی
ہے جس کا ثبوت اس کا افسانہ نمبر ہے، اس نمبر مین ہر رنگ ومذاق کے اچھے افسانے فراہم کئے گئے
ہین "یونانی رقاصہ" "ایلچی" "بوڑھی ایکٹرس" اور "دختر صحرا" دلچسپ اور پڑھنے کے لائق افسانے ہین
مفید اور نتیجہ خیز افسانون کی بھی خاصی تعداد ہے، ان مین "دلہن کا سلام" "خانہ خدا" "جواری" اور
"دوسری بیوی" خاص طور سے سبق آموز ہین، نظم کا حصہ بھی غنیمت ہے، ظاہری زینت کے لئے چند نقاشی وغیرہ
بھی زیب رسالہ ہین، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر نہایت کامیاب ہے،

ادب محمود آباد نمبر، مرتبہ جناب ناصر لکھنوی حجم ۹۰ صفحات کاغذ صاف و دبیز
کتابت وطباعت بہتر، قیمت درج نہین، غالباً ایک روپیہ تک ہوگی، پتہ دارالاشاعت
نظامی پریس لکھنؤ،

ادب لکھنؤ کے وقیع اور سنجیدہ رسالون مین ہے، والی ریاست محمود آباد کی گدی نشینی کی تقریب
کی یادگار مین اس نے "محمود آباد نمبر" نکالا ہے، جسمین علمی، ادبی، تاریخی، اور افسانے ہر مذاق کے مضامین ہین،
محمود آباد نمبر کی مناسبت سے ریاست محمود آباد کی مختصر تاریخ اور اوس کے امرار کے حالات ہین، علمی
مضامین مین مولوی سید ظفر الحسن کا تنقیدی مضمون "خواب نوشین یا نغمۂ غم" مفید اور فارسی زبان
سے ذوق رکھنے والون کے پڑھنے کے لائق ہے،

موجودہ دور کی تنگ نظری نے جسے خوش مذاقی اور سلامت ذوق سے تعبیر کیا جاتا ہے داغ
کی شاعری پر بڑا ظلم کیا ہے، اور اوس کے بانکپن اور اوس کی دلکش شوخیون کو اخلاقی نقطۂ نظر سے
نشانہ ملامت بنایا جاتا ہے، لیکن سلیم المذاق ناقدین یہ نہین سمجھتے کہ وہ کوئی واعظ نہین، مصلح نہین،

بلکہ صرف مصور جذبات شاعر ہے، اس لئے اس کی شاعری سے اخلاقی سبق حاصل کرنے کی توقع کرنا خود اپنی غلطی ہے، ہماری زبان کے مشہور کہنہ مشق ادیب مرزا عسکری صاحب نے داغ کی شاعری پر ایک بسیط نظر، میں داغ کی خصوصیات دکھائی ہیں، اور مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ معاملہ بندی جو داغ کی شاعری کا جزو شمار کی جاتی ہے، ہمیشہ سے شعراء کا موضوع سخن رہی ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ داغ کے یہاں یہ رنگ زیادہ ہے، پھر بھی اونھوں نے جس شائستگی سے اس کو برتا ہے وہ دوسروں کے بس سے باہر تھا،

مسدس حالی کے معترفین کی بے اعتدالیاں" کے عنوان سے مسدس اور اوس کے تقریب نگاروں کی تحریروں پر جو تبصرہ کیا گیا ہے، اگر وہ محض انیس پر حملے کے جواب کی حد تک محدود رہتا تو قابل اعتراض نہ تھا، لیکن اس لپیٹ میں غریب مسدس کو لے لینا کون سا اصول نقد اور کہاں کا انصاف ہے، ان کے علاوہ اور متعدد مضامین اور افسانے اور امرائے محمود آباد اور تقریب جشن کے متعدد فوٹو ہیں،

عصمت راشد الخیری نمبر، مرتبہ رازق الخیری صاحب حجم ۲۹۰ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰، کاغذ سپید کتابت و طباعت معمولی قیمت ۸؍ سالانہ للعہ، پتہ دفتر عصمت کوچہ چیلان دہلی،

مولانا راشد الخیری مرحوم کے لائق فرزند اور جانشین رازق الخیری صاحب نے اپنے والد مرحوم کی یادگار میں ان کے محبوب رسالہ عصمت کا خاص نمبر نکالا ہے، مولانا مرحوم جیسی جامع اور ہمہ گیر شخصیت رکھتے تھے، اور اونھوں نے زبان و ادب اور نسوانی دنیا کی جیسی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اسکے لحاظ سے انکی ضرورت تھی کہ اون کی زندگی کے ہر پہلو کو دکھایا جاتے، اس نمبر نے اس ضرورت کو پورا کر دیا، اور مولانا مرحوم کے اعزہ احباب، قدردانوں اور ہندوستان کے بہت سے مشاہیر اور اہل قلم نے انکی خانگی، معاشرتی زندگی انکی علمی اور قومی خدمات، ان کے کارناموں غرض اون کی زندگی کے ہر پہلو پر معلومات کا کافی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، مولانا کی علمی اور قومی خدمات سے تو کم و بیش تعلیم یافتہ طبقہ واقف تھا، لیکن انکی خانگی زندگی کے واقعات اور اون کے محاسن اخلاق اس آئینہ کے علاوہ اور کہیں نظر نہ آ سکتے تھے، مضامین کے علاوہ

اس نمبر میں متعدد نظمیں جو مولانا کی وفات پر لکھی گئی ہیں، مرثیہ خوان میں مختلف ماتموں کی چند تصاویر بھی ہیں،

کنول آگرہ کا خاص نمبر، مرتبہ منظر صاحب صدیقی اکبرآبادی حجم ۱۴۴ صفحات تقطیع اوسط کاغذ کتابت طباعت صاف اور عمدہ قیمت ۱۲؍ سالانہ چندہ عہ پتہ جینگ کی منڈی آگرہ،

آج کل ہر رسالہ اپنی ترقی کے ثبوت میں کوئی نہ کوئی خاص نمبر ضرور پیش کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ابھی کنول کو نکلے زیادہ زمانہ نہیں گذرا لیکن اوسکو خاص نمبر نکالنا پڑا، ظاہر ہے کہ ایک نونہال سے اس باب میں وہ اہتمام ممکن نہیں ہے، جو ایک جہاندیدہ سے ہو سکتا ہے، اسلئے معنوی اعتبار سے دوسرے سالناموں کے مقابلہ میں اس کا پلہ کچھ ہلکا نظر آتا ہے، پھر بھی اسکی عمر کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہے، سنجیدہ مضامین میں "سلطنت آصفیہ کا نامور بانی" "شاعر و ناظم کی سرحد امتیازات" اور "وکٹر ہیگو" خاصے مضامین ہیں، افسانوں میں "بدنصیب" ظاہر بین اور ظاہر پرست دنیا کے لئے عبرت آموز ہے، "اناطول فرانس کے مشہور ناول تائیس" کا ترجمہ عرصہ ہوا نامور ادیب مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے قلم سے شائع ہو چکا ہے، پھر ل احمد صاحب کی اس سعی رائگان سے کیا حاصل ہے؟ "کنول" "ارض سخن" اکبرآباد کا رسالہ ہے، اسلئے قدرۃً نثر کے مقابلہ میں نظم کا پایہ زیادہ بلند ہے، مشاہیر شعراء کی اچھی اچھی غزلیں اور نظمیں ہیں، قدامت کے لحاظ سے "مثنوی سحر معنی" لائق ذکر ہے،

مساوات کا سالانہ نمبر، مرتبہ محمد منیر الدین صاحب حجم ۱۴۴ صفحات کاغذ کتابت و طباعت عمدہ اور صاف قیمت ۱۲؍ سالانہ قیمت ۶؍ پتہ دفتر مساوات پھلواری شریف پٹنہ،

اس لحاظ سے مساوات کو ایک گونہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ایک خاص مقصد اپنے پیش نظر رکھتا ہے، یعنی مساوات اسلامی کی تعلیم اور اسکی تبلیغ و اشاعت، اسلئے سالنامہ میں خاص طور سے اس موضوع اور اس کے متعلقات پر اچھے مضامین فراہم کئے گئے ہیں، لیکن ان میں بعض بحثیں غیر متعلق آگئی ہیں، اور کہیں کہیں لہجہ اور الفاظ میں درشتی اور تلخی پیدا ہو گئی ہے، جو ممکن ہے بعض جماعتوں کی دل آزاری کا باعث ہو، یہ طرز تبلیغ اصولی حیثیت سے نہ مناسب ہی ہے اور نہ مفید، بغیر ان مباحث کے بھی مساوات اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا،

شاہ محمد جعفر صاحب خطیب جامع کپورتھلہ کا مضمون "اسلام اور طلاق" مفید اور پر از معلومات ہے "تاثیر القرآن فی حیات الانسان"، "صوفی اقبال"، "اچھوتون اور ملت اسلامیہ کا نصب العین"، "مسلمان بادشاہون کی انصاف پسندی" اچھے مضامین ہین، مولانا شاہ سلیمان قدس سرہ کے بعض ملفوظات تبرکاً شامل رسالہ ہین، نظم کا حصہ بھی خاصہ ہے، جماعت مومنین کے چند ممتاز افراد کی تصویرین زیب رسالہ ہین،

سفیر سخن کا اردو ہندی سرکلر نمبر، مرتبہ ابوالکیف صاحب سرحدی حجم ۲۸ صفحات، تقطیع ۲۰×۳۰ کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۸ر سالانہ قیمت ۳ر پتہ منیجر مجلہ سفیر سخن پشاور سرحد،

سفیر سخن کئی سال سے پشاور جیسے دور و دراز مقام سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے ۳۶ء کا خاص نمبر اس نے "اردو ہندی سرکلر نمبر" کے نام سے نکالا ہے، اردو ہندی کا جھگڑا اتنا عالمگیر ہوگیا ہے کہ صوبہ سرحد بھی اس سے نہ بچ سکا چنانچہ وہان بھی کئی سال سے یہی کشمکش جاری ہے، کچھ عرصہ ہوا وہان کے شعبہ تعلیم نے بعض مالی دقتون اور صوبہ سرحد کی اکثریت (جسے کلیت کہنا زیادہ موزون ہے) کے جذبات کو مدنظر رکھکر ایک سرکلر جاری کیا تھا جس کی رو سے پانچ سال کے لیے تجربۃً صوبہ کی عام اور مشترک زبان ہندوستانی ذریعہ تعلیم قرار دیگئی تھی، اس سرکلر مین بھی پہلی دو جماعتین اس حکم سے مستثنیٰ رکھی گئی ہین، اور ان مین ہندی گورمکھی اور پشتو زبان مین تعلیم دینے کی آزادی حاصل تھی،

اس سرکلر کو بھی حسب معمول ہندوؤن نے فرقہ دارانہ آنکھ سے دیکھا، اور پشاور سے لیکر پنجاب بلکہ دوسرے صوبون تک ایک شور مچ گیا، اخبارات مین اسکے خلاف بڑے بڑے مضامین نکلے، جلسون مین پر زور تقریرین ہوئین کونسل مین سوالات ہوئے غرض ہر سمت ایک غل مچ گیا، جس کی تفصیلات اخبارات مین آچکی ہین، سفیر سخن کے اس خاص نمبر مین اس سرکلر کے اسباب و نتائج کے متعلق تفصیلی معلومات و مضامین جمع کئے گئے ہین، ان کے دیکھنے سے صوبہ سرحد کے ساتھ ہندوؤن کے اس دیرینہ عناد کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے جس کا ثبوت وہ ہمیشہ سے دیتے چلے آئے ہین، اس سلسلہ مین بہت سے دلچسپ اور حیرت انگیز

معلومات جو اس موضوع سے متعلق ہین سامنے آگئے ہین، یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ صوبہ سرحد مین بھی جہان پچانوے فیصدی مسلمان اور صرف پانچ فیصدی سکھ اور ہندو ہین ستر فیصدی سکھون اور ہندوؤن کی تعلیم پر صرف ہوتا ہے، اور صرف تیس فیصدی جاہل مسلمانون پر اور سرکاری و غیر سرکاری تمام محکمون مین بڑے بڑے عہدون پر ہندو ہی قابض ہین، اس خاص موضوع کے متعلقہ مضامین کے علاوہ عام دلچسپی کے لئے متعدد سنجیدہ مضامین اور افسانے بھی ہین،

طلبہ کا سالگرہ نمبر، مرتبہ محمد ابراہیم صاحب صدیقی و محبوب الرحمن صاحب حجم ۱۰۶ صفحات تقطیع (۲۰×۳۰) کاغذ سپید، کتابت وطباعت اچھی، قیمت آٹھ آنے، سالانہ قیمت عہ ر پتہ دفتر طلبہ عیدگاہ مجگوان بارا عیدگاہ پورنیہ،

جیسا کہ اس رسالہ کے نام سے ظاہر ہے، یہ خاص طلبہ کا رسالہ ہے، جو ان مین تحریر و مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لئے نکلتا ہے، لیکن مضامین مین طلبہ کی تخصیص نہین ہے، طلبہ کو دیکھتے ہوئے سالنامہ خاصہ ہے، سنجیدہ، مزاحیہ، افسانے ہر قسم کے مضامین ہین، افسانون کا حصہ زیادہ ہے، لیکن طلبہ کے مفاد کے مضامین سے سالنامہ بالکل خالی ہے حالانکہ یہ موضوع اس رسالہ کا خاص مقصد ہونا چاہئے، چند نظمین بھی ہین، بہرحال مجموعی حیثیت سے طلبہ کی یہ کامیاب کوشش لائق ستایش ہے،

ہمدرد صحت دہلی کا عورت نمبر، مرتبہ حکیم حاجی عبدالحمید صاحب دہلوی، حجم ۲۰۶ صفحات، تقطیع (۲۲×۲۹) کاغذ سپید کتابت وطباعت عمدہ، قیمت سالانہ ایک روپیہ خاص نمبر کی قیمت باختلاف کاغذ ۱۲ر و ۸ر پتہ ہمدرد منزل لال کنوان دہلی،

طبی رسالون مین ہمدرد صحت نہایت مفید رسالہ ہے، جو اپنی ادویہ کے اشتہار کے ساتھ صحت و علاج کے متعلق مفید مضامین پیش کرتا ہے، حال مین اوس نے ایک خاص نمبر

"عورت نمبر" کے نام سے نکالا ہے، عموماً اس قسم کے نمبرون مین ترغیباتِ جنسی کے مضامین کے علاوہ کچھ نہین ہوتا، لیکن ہمدردِ صحت کا یہ نمبر خالص طبی نقطۂ نظر سے شائع کیا گیا ہے، اس مین نسوانی اعضا، اون کے وظائف، امراض، علاج، حمل، اوس کے مدارج، اُسکی احتیاطین، وضع حمل، ان کے معالجات اور عام صحت و تندرستی وغیرہ عورت کے جملہ متعلقات پر طب جدید و قدیم دونون کے نہایت مفید اور پر از معلومات مضامین ہین، اسلئے یہ نمبر نہ صرف عام لوگون کے لیے بلکہ خواص اور اطبا کے لئے بھی معالجاتِ نسوانی کا ایک اچھا نصاب ہے، رسالہ مین نفس موضوع کے متعلق اور بعض مقالہ نگارون کی متعدد تصاویر ہین،

صدائے نسوان سالانہ نمبر، مرتبہ انور بزمی و سعید الرحمٰن صاحب، حجم ۱۲۰ صفحات، تقطیع ۲۰×۳۰ کاغذ سپید، کتابت و طباعت اچھی، سالانہ قیمت سے رسالنامہ کی قیمت علحدہ نہین، پتہ صدائے نسوان ترکمان گیٹ دہلی،

سالنامون کی کچھ ایسی ہوا چل گئی ہے کہ نو مولود رسائل ابھی اپنے پیرون پر کھڑے بھی نہین ہونے پاتے کہ اون کو سالنامے کے لئے دوا دوش کرنی پڑتی ہے، جس کا بار ان کی طاقت سے باہر ہوتا ہے، صدائے نسوان معمولی اشاعتون مین اوسط درجہ کا خاصہ نسوانی رسالہ ہے، لیکن سالنامے کا بار وہ نہ اوٹھا سکا، اس لئے اوس کے بیشتر اچھے مضامین "مذہب اسلام"، "خازنۂ اسلام"، "نظام اخلاق" اور "صحت و تندرستی" پورے کے پورے کتابون سے منقول ہین، چند نئے اور مفید مضامین بھی ہین، "اخبار و افکار" کے ماتحت عورتون کے لئے مفید معلومات جمع کئے گئے ہین، "ترکی خواتین کے حالات" "روسی خواتین کی آزادی" اور "اسلام اور طبقۂ نسوان" عورتون کے پڑھنے کے لائق ہین، لیکن پھر بھی خالص نسوانی مذاق کے مضامین کی جو اس رسالہ کی اصل غرض و غایت ہے، بڑی کمی ہے،

"م"

مطبوعات جدیدہ

کسان (اس کے افلاس کے اسباب اور ان کا علاج) مصنفہ چودھری مختار سنگھ سابق ایم ال اے ایم ال سی، ممبر سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی، مترجمہ محمود علی خانصاحب جامعی تقطیع چھوٹی، حجم ۲۰۵ صفحات کاغذ کتابت و طباعت صاف و روشن قیمت عہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے ملسکتی ہے،

یہ مفید اور ضروری کتاب جو ہندوستان کے سب سے اہم طبقہ کسان کی صلاح و فلاح سے متعلق ہے، چار حصون مین تقسیم ہے، پہلے میں ان مغالطہ آمیز خیالات کی جو عام طور پر کسان کے افلاس اور زبون حالی کا سبب بیان کئے جاتے ہین، یعنی اوسط پیداوار کی کمی، زراعت کے جدید ترقی یافتہ وسائل سے ناواقفیت، اور ان کے استعمال سے بے خبری، کھیتوں کا منتشر ہونا، اضافہ آبادی، بارش کی قلت، کسانوں کی فضول خرچی، مہاجنی قرضوں کا بار وغیرہ بدلائل تردید کی گئی ہے، اور دوسرے ملکوں کا موازنہ کر کے ان خیالات کی غلطی واضح کی گئی ہے،

دوسرے حصہ میں ہندوستان کے قدیم اور مفید دیہی نظام کو جو عہد مغلیہ تک علیٰ حالہ قائم تھا، دکھایا گیا ہے، کہ اس زمانہ میں ہر دیہات ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا، اور اپنی ضروریات میں کسی بیرونی امداد کا محتاج نہ تھا، زراعت اجتماعی تھی، ہر گاؤن میں غلہ کے ذخائر رہتے تھے، جس مین بقدر خدمت استحقاق گاؤن کا ہر فرد حصہ دار تھا، سادہ زندگی کی جملہ ضروریات ہر گاؤں میں موجود تھیں، معاملات کے تصفیے کے لئے پنچایتیں موجود تھین جو بغیر کورٹ فیس کے بڑے بڑے معاملات کا عادلانہ فیصلہ کرتی تھین، بقدر ضرورت تعلیم و صفائی کا بھی انتظام تھا، غرض ہر گاؤن معاشرتی زندگی کی ضروریات میں بیرونی دنیا کا محتاج نہ تھا، موجودہ نظام حکومت نے اس مفید نظام کو تباہ کر دیا، پھر اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے، کہ ہندوستان محض ایک زرعی ملک ہے اور

پرانی سرکاری رپورٹوں اور تاریخوں سے اس کے مصنوعات کے شواہد پیش کرکے دکھایا ہو کہ صنعتوں کے جبر بربادکر
کے بعد جب آبادی کا ایک بڑا حصہ بیکار ہو گیا، اسوقت اس نے مجبور ہوکر زراعت کا پیشہ اختیار کیا،

تیسرے حصہ میں زراعت کے خصوصیات اور اسکی کامیابی کے اصول و اسرار پر بحث ہی، پہلے موجودہ
زمینداری سسٹم میں زمین پر کسانوں کی ملکیت نہ ہونے کے نقائص دکھائے ہیں، پھر ہندوستان کی مالی تنظیم
پر جو شرح تبادلہ، شرح بنک، سرکاری قرضہ جات، کرنسی نوٹ وغیرہ کے اقتصادی مسائل پر مشتمل ہی، بحث
ہے، اور کسان و زراعت پر اس کے اثرات و نتائج دکھائے گئے ہیں، پھر ہندوستان میں وسائل حمل و نقل
(ریلوے) کے بیجا اور ناقابل برداشت محاصل اور زراعت پر اس کے نتائج کو دکھایا گیا ہی، آخر میں ہندوستان
کی عام تعلیمی حالت اور اس کے نقائص کا نقشہ پیش کرکے زرعی تعلیم و تحقیقات اس کی اقتصادی تنظیم کوا پریٹو
سوسائٹیوں کی عام ترویج، مویشیوں اور فصلوں کی اصلاح، چراگاہوں کے انتظام، زراعت کو آفات
ارضی و سماوی سے بچانے کے وسائل، اور ان کے لئے منظم اداروں کے قیام، دیسی صنعتوں کے احیاء اور سامان
حمل و نقل کے محصولات میں کمی پر زور دیا گیا ہی، ان کے علاوہ بہت سے جزوی مباحث ہیں، کوئی پہلو
تشنہ نہیں چھوڑا ہے، اور ہر بحث سرکاری اعداد و شمار، تاریخی شواہد اور دوسرے ملکوں کے موازنے
مدلل ہی، چوتھے حصہ میں چند مفید مشورے ہیں،

محمود علی خانصاحب نے اس مفید اور ضروری کتاب کا ترجمہ کرکے بڑی مفید خدمت انجام دی
ہے، ترجمہ اتنا صاف ستھرا اور روان ہے، کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا،

جاپان مصنفہ مسٹر چمن لال تقطیع اوسط ضخامت ۲۱۱ صفحات کاغذ کتابت و طباعت روشن،
قیمت غیر مجلد عہ اور مجلد عاؔ مترجمہ محمود علی خانصاحب، مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

آج سے چوتھائی صدی پیشتر ہندوستانی زبان میں مشرق کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک جاپان
کے متعلق کوئی سرمایۂ معلومات نہ تھا، ادھر چند برسوں میں جو چند کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں، انکی تعداد بھی

نہ ہونے کے برابر ہے، ان میں سب سے زیادہ مفصل، جامع اور پر از معلومات شیخ بدر الاسلام فضلی کی کتاب
حقیقت جاپان ہی، جس پر ان اوراق میں ریویو ہو چکا ہے، زیر تبصرہ کتاب اس موضوع پر ایک مفید اضافہ ہے،
مسٹر چمن لال نے تقریبًا دو سال ہوئے، ساری دنیا کی سیاحت کی تھی، اس سلسلہ میں انھون نے
جاپان کو بھی دیکھا، زیر نظر کتاب اسی سفر کا نتیجہ ہے، چونکہ مصنف قوم پرور جماعت سے تعلق رکھتا ہے، اسلئے
اس نے زیادہ تر اسی نقطۂ نگاہ سے جاپان کو دیکھا ہے، جس کی جھلک کتاب کے ہر صفحہ پر نظر آتی ہے، چنانچہ
اس کتاب میں جاپان کی صنعتی ترقیون کی تفصیلات اور ان کے اعداد و شمار سے زیادہ اس کے اسباب و علل اور
بنیادی امور دکھائے ہیں، مثلاً جاپانیون کے خصائص، انکی قومیت و وطن پرستی، اور ان جذبات کی وسعت اور ہمہ گیری، ان کی
اعلی سیرت، استقلال، محنت و سادگی، ضبط و نظام، شہنشاہ سے عقیدت، ملکی صنعت و حرفت کی ترقی میں حکومت
کی امداد، جاپانیوں کا اصول تجارت و صنعت، مزدورون کا نظام، ان سے ہمدردی، معاشرت کی سادگی،
اخبارات کی کثرت، عوام کا ذوق مطالعہ، تعلیم کی عمومیت و ہمہ گیری، صنعتی تعلیم کی اہمیت و وسعت، جاپانی
صنعت کی معاون قدرت کی فیاضیان، جنگلات، معدنیات اور پیداوار وغیرہ، اور ان سب کے نتائج،
ان بنیادی اور اصولی امور کے ساتھ ساتھ عام واقفیت کے لئے وہان کے صنعتی، حرفتی، تعلیمی، تمدنی
ترقیون، اور جاپانی معاشرت کے مختلف پہلوؤن، ان کے عقائد و مراسم ملک کی سرسبزی و شادابی،
اور قدرتی مناظر کے حالات بھی ہین، معاشرت میں ہندوستان کے ساتھ جابجا موازنہ بھی کیا گیا ہے، چند
تصویریں بھی ہیں، غرض مجموعی حیثیت سے یہ کتاب نہایت مفید و کارآمد اور ہندوستانیون کے لئے سبق آموز
ہے، محمود علی خان صاحب شکریہ کے مستحق ہین، کہ انھون نے اس کتاب کو ہندوستانی زبان کا جامہ پہنا کر
عام لوگون کو بھی اس سے استفادہ کا موقع دیا،

رسالۂ دینیات حصۂ اوّل دوم، سوم چہارم	مرتبہ مجلس نصاب کتب شعبۂ دینیات و اخلاقیات سلسلہ کتب درسیۂ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کاغذ کتابت و طباعت و دیدہ زیب تقطیع متوسط حجم علی الترتیب

۱۶، ۲، ۵، ۵ سو قیمت ۱ر ۱۱ر ۱۴ر پتہ مولوی سید عبدالقادر صاحب و مولوی غلام دستگیر صاحب تاجران کتب چار کمان حیدرآباد دکن،

یہ رسالے ابتدائی جماعتون کیلئے لکھے گئے ہیں، پہلے حصہ میں اللہ اسکے رسول اور دین اسلام کو سمجھایا گیا ہے پھر ہمسایگی میل، استاد کا ادب، سچائی اور دیانت وغیرہ کی خوبیاں دکھائی گئی ہین، دوسرے حصہ میں ایمان اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلامی عقائد، فرشتے اللہ تعالیٰ کی کتابیں اسکے انبیا و رسل قیامت حشر و نشر اور تقدیر، پھر صفائی و طہارت سچائی رشتہ دارون اور پڑوسیون کے حقوق کی اخلاقی تعلیمات ہین، تیسرے حصہ میں بڑے بڑے پیغمبروں کے نام اور آنحضرت صلعم کے مختصر حالات ہیں، پھر وضو تیمم نماز کے طریقے اور انکے متعلق ضروری مسائل بتائے گئے ہین، انکے بعد اتفاق محنت اخوت بچائی ہمدردی سخاوت اور غرور کے مفید اور اخلاقی اسباق ہین، آخر میں اذان، اقامت اور نماز کی دعائین ہین چوتھے حصہ مین جمعہ عیدین اور جنازہ کی نمازیں زکوٰۃ، صدقہ فطر، قربانی، عقیقہ، حج اور جہاد کے ضروری اور ابتدائی مسائل ہین پھر عام فہم زبان میں آنحضرت صلعم حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور عائشہ صدیقہ کی مختصر سیر پاک اور بقیہ ازواج مطہرات کے اسمای گرامی ہین اہل بیت نبوی میں فاطمہ زہرا اور حسنین علیہما السلام کے مختصر حالات اور عشرہ مبشرہ کے نام گنائے گئے ہین، آخر میں ایفاے عہد امانت و دیانت، راست بازی، ایثار، حسد سے احتراز، سادہ زندگی اور استقلال اور عفو کی اخلاقی تعلیمات ہین، ضمیمہ مین جمعہ ان، اقامت، اذکار نماز، اور افطار، جنازہ اور قربانی وغیرہ کی دعائیں ہیں، نصابی کتابون کے طرز پر ہر سبق کے آخر مین اسکے متعلق سوالات ہیں، کتاب بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے نہایت مفید ہے،

گردشِ ایام از جناب حکیم شرافت حسین صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۲ صفحات کاغذ سپید کتابت و طباعت بہتر، قیمت درج نہیں پتہ حکیم شرافت حسین صاحب مکان شیخ اقبال علی صاحب ایڈوکیٹ بھوپال ہاؤس گھسیاری منڈی لکھنؤ،

اس کتاب میں قصہ کے پیرایہ میں مسلمانون کے بیجا رسوم اور اسراف کے تباہ کن نتائج دکھائے گئے ہین، ایک رئیس زمیندار رسوم کے بیجا مصارف کیوجہ کر اپنی جائداد پر اتنا بار چھوڑ جاتا ہے کہ اسکا لڑکا کفایت شعاری کے باوجود اسکو ادا نہین کر سکتا، اور اسی غم میں مرجاتا ہے، ساری جائداد نیلام ہو جاتی ہے اور گھر برباد ہو جاتا ہے اس کا کم سن مگر غیور لڑکا اپنی محنت سے ترقی کر کے پھر خاندان کی عزت بحال کرتا ہے، یہ حقیقت آمیز افسانہ مفید اور سبق آموز ہے،

(م)

دارالمصنفین کی ادبی کتابیں

شعر الہند حصہ اول، جس میں قدماء کے دور سے لے کر دور جدید تک اردو شاعری کے تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کی گئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ مطبوعہ معارف پریس، ضخامت ۵۴۴ صفحے قیمت للعہ مولانا عبدالسلام ندوی،

حصہ دوم، جس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے، کاغذ و کتابت عمدہ، ضخامت ۴۵۹ صفحے قیمت:- للعہ

گل رعنا - اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو میں شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے جس میں آب حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر حالی و اکبر تک کے حالات، ضخامت ۵۴۰ صفحے، قیمت:- صہ، از مولانا سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم،

مکاتیب شبلیؒ، مولانا شبلی مرحوم کے دوستون، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ جس میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، یہ درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ ہے، طبع دوم،

حصہ اول - ضخامت ۳۴۹ صفحے، قیمت:- عہ ۱۲ر
حصہ دوم، ، ۲۶۱ ، ، ، عہ ۱۲ر

موازنۂ انیس و دبیر (از مولانا شبلیؒ) اردو کے مشہور باکمال شاعر میر انیس کی شاعری پر ریویو اردو میں فصاحت و بلاغت کے اصول کی تشریح، مرثیہ کی تاریخ، میر انیس کے بہترین مرثیوں کا انتخاب اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ، اردو میں اپنے فن میں یہ پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۸۴ صفحے، قیمت: سے ۔

کلیات شبلی اردو، مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں، جو کانپور، ٹرکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں یکجا ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کے چہل سالہ جد و جہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ، ضخامت ۱۳۰ صفحے، قیمت:- عہ

افاداتِ مہدی، ملک کے نامور انشاپرداز مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی کے ۳۰ مضامین کا مجموعہ مع مقدمہ و ضمیمہ جات، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت: ہے ۔ حجم ۳۷۵ صفحے،

سرگذشت ادب ترکی، جس میں ترکی ادب کی مختصر اجمالی تاریخ دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے، ۲ر کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں، (از مولانا سید ریاست علی ندوی)